Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1960ء

بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ھادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھکر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی درین دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

(پرویز ـــــ "معراج انسانیت")

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت کا پتہ	ہند و پاکستان سے	ہند و پاکستان سے سالانہ ۸ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور	بارہ آنے	غیر ممالک سے ۱۶ شلنگ

نمبر ۹	ستمبر سنہ ۱۹۶۰	جلد ۱۳

فہرستِ مضامین

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است	۲
اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا	۳
لمعات	۴
اسلام میں پیغمبری	۱۷
قائدِ اعظم (محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۱
چند احادیث کے اشکالات اور انکی توضیح	۵۹
حقائق و عبر	۶۷
رابطۂ باہمی	۷۷

آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

اُو دلے در پیکرِ آدم نہاد
اُو نقاب از طلعتِ آدم کشاد

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

ہر خداوندِ کہن را اُو شکست
ہر کہن شاخ از نمِ اُو غنچہ بست

عقل را اُو صاحبِ اسرار کرد
عشق را اُو تیغِ جوہر دار کرد

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد

دینِ اُو آئینِ اُو تفسیرِ کُل
در جبینِ اُو خطِ تقدیرِ کُل

(اقبالؒ)

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا[1]

تیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیا ایامِ صلح — جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئینِ محبت تازہ کن

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

نوعِ انساں مزرعِ و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

(اقبال)

---

[1] یعنی نظامِ خداوندی جو حضورؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اس دفعہ جوں جوں برسات کا موسم گذرتا جاتا ہے، لوگوں کو اطمینان کا سانس آ رہا ہے کہ امسال ملک اس سیلاب سے محفوظ رہا ہے جو گذشتہ کئی برسوں سے عالمگیر تباہی کا موجب بنتا چلا آ رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کا دریاؤں کے سیلاب سے محفوظ رہنا موجب ہزار خیر و برکت ہے۔ لیکن جن لوگوں کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہوئی ہے ان کی نگاہیں ایک اور سیلاب کو دیکھ رہی ہیں جو ملک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جس کی تباہ کاریاں دریاؤں کے سیلاب سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی سطح پر آتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب زندگی کی گہرائیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ دریاؤں کا سیلاب بارش کے پانی سے اُمنڈ آتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کے چشمے انسانی قلوب سے ابلتے ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب موجودہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کی تلاطم خیزیاں آنے والی نسلوں تک کو محیط ہوتی ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب دل کی کھیتیوں کو ویران کر دیتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب سے ایسی وبائیں پھوٹتی ہیں جن سے انسانوں کے جسم ہلاک ہوتے ہیں لیکن اس دوسرے سیلاب سے پیدا شدہ جراثیم سے قوم کی روح میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب کا اثر ایک آدھ موسم تک رہتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کا اثر نسلوں تک مسلسل آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب میں افراد ڈوبتے ہیں۔ اس دوسرے سیلاب میں قوم کی قوم ڈوب کر تباہ ہو جاتی ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ یہ دوسرا سیلاب کونسا ہے جس کی تباہ کاریاں اس قدر شدید، وسیع اور گہری ہیں؟ یہ سیلاب ہے قوم کے نوجوانوں کی آوارگی جس کی لپیٹ میں اس وقت ہمارا ملک بری طرح آ چکا ہے۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔ ان کی حرکات آوارگی کی حد سے آگے بڑھ کر جرائم پیشگی تک پہنچ چکی ہیں ان کے ہاتھوں شریف انسانوں کا جینا حرام ہو رہا ہے۔ شریف زادیاں ان کے ڈر سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ خود ان

کے ماں باپ ان کے ہاتھوں نالاں ہیں، معاشرہ ان کی حرکات سے لرزاں و ترساں ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سیلاب بلا کا علاج کیا کیا جائے؟

اس میں شبہ نہیں کہ بدقسمتی سے، ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر طبقہ اسی آوارگی کا مظہر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ آوارگی ایک دن کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ آگ مدتوں سے سلگ رہی تھی۔ اب بھڑک اٹھی ہے۔ اس کے خلاف قوم کے ارباب حل و عقد اور اصحاب فکر و نظر کا احتجاج بھی حق بجانب ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان نوجوانوں کی اس آوارگی قلب و نگاہ کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر آپ بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس فسادِ قلب و نظر کی ساری ذمہ داری انہی بڑے بوڑھوں کے سر پر عائد ہوتی ہے جو اس کے خلاف اس شدت سے واویلا کر رہے ہیں۔ قوم کے بچے گِلِ کوزہ گراں (کمہار کی مٹی) ہوتی ہے جسے جس شکل میں چاہے تشکیل کیا جا سکتا ہے یہ وہ خام مواد (RAW MATERIAL) ہوتا ہے جس سے آپ جو جی میں آئے بنا لیں۔ یہ وہ پگھلنے والی دھات ہے جسے جس قالب میں چاہے ڈھالا جا سکتا ہے ہمارے نوجوان جو کچھ بن کر سامنے آئے ہیں یہ از خود ایسے نہیں بن گئے۔ یہ ہمارے بنائے ہوئے ایسے بنے ہیں۔ ان کی اس آوارگی کے ذمہ دار ہم خود ہیں جنہوں نے ان کی صحیح تعلیم کا کوئی بندوبست کیا، نہ تربیت کا۔ یہ وہ خطرہ تھا جسے ہم نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد محسوس کیا تھا اور قوم کے ذمہ دار حضرات سے کہا تھا کہ سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں۔ آپ جون کے لمعات سامنے لایئے۔ ہم نے قوم کے ذہنی انتشار اور فکری آوارگی" کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

> قوموں کی تعمیر کے دو گوشے ہوتے ہیں ایک تو موجودہ نسل کی صلاحیتوں کی بیداری۔ اور دوسرے آنے والی نسل کی صحیح تربیت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی موجودہ نسل میں ارتقاع و ارتقاء کی صلاحیتیں ہی باقی نہ رہی ہوں۔ اس صورت میں ارباب فکر و نظر کی پوری توجہات آنے والی نسل پر مرکوز ہو جاتی ہیں تاکہ یہ ابھرنے والے پچے سیلابِ دگل کے بجائے زندگی کے جیتے جاگتے مجسمے بن کر سامنے آئیں۔
>
> صاحب ضربِ کلیم حضرت موسیٰ نے جب بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے نجات دلائی ہے تو ان کے سامنے یہی مقصد جلیل واضح تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرعون کی انسانیت کش حکمتِ عملی نے کس طرح نہ صرف بنی اسرائیل کی نسل حاضر کو زندگی کی لذتوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے بلکہ وہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی کس بری طرح سے ذبح کئے جا رہا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو محکومی کے چنگل سے نکالا تو اپنی تمام سعی و کاوش آنے والی نسل کی تربیت کے لئے وقف کر دی نتیجہ یہ کہ جب وہ دشت میں پلے ہوئے جوان ہوئے تو انہوں نے نظامِ کہن کی ہر فرسودہ بساطِ کہن کو الٹ کر رکھ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں اور یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس دو سال کے عرصۂ آزادی میں ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ان کا دل و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائے جو ہمارے تصورِ حیات کا آئینہ ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں اس سوال کا جواب حد درجہ مایوس کن ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کوتاہی کے لئے کوئی بھی

وجہ جواز ہو سکتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کارخانے کھولنے کیلئے مشینوں کی ضرورت ہے جو ممالک غیر سے منگانی پڑیں گی۔ اس لئے یہ احتیاج ہماری صنعت و حرفت کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسلحہ و آلات عسکریت کے لئے بھی بیرونی امداد کی احتیاج ہے اس لئے ہم اس باب میں بھی معذور ہیں۔ آپ کہیں فنی (TECHNICAL) شعبوں میں ٹریننگ کے لئے ماہرین فنون کی ضرورت ہے جن کی ہمارے ملک میں سر دست کمی ہے اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصاب تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کونسا سنگ گراں حائل ہے جس کے لئے آپ

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں

ایک سال کے بعد ہم نے اسی حقیقت کو اور وضاحت سے بیان کیا تھا جب لکھا تھا کہ

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستان بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے۔ اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحب ضرب کلیم کے ید بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطہ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطہ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین پیغمبر ان کے مابین موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے کہہ دیا کہ ان کو انہیں کے حال پر چھوڑ دو اور صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ بن جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مردہ دل اور بوسیدہ ہڈیاں وقت رفتہ ختم ہوتی گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے ابھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارض موعود پر قابض ہو گئے جس میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ رو دیجئے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کس قابلیت کا ہے نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رو سے کس قدر خام ہے۔ رو دیجئے اس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔

حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقش قدم پر چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں اسکول کھول دیجئے اور ہر سکول کا نتیجہ سو فیصدی دکھا دیجئے۔ تو ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی

خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں۔ ہر سوسائٹی کی زندگی چند اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ یہ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر اس کی دلکشی اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور حکمتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی (ربوبیت) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم بھیڑیوں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لاتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جن سے انسانیت کی پوری پوری نشوونما ہو جاتی ہے اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر تشکیل ہوتی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے کہ رتبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے ممالک سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیریکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو ہی رفع بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

(طلوعِ اسلام اگست سنہ ۱۹۵۰ء ص ۷-۹)

ہم اپنی اس پکار کو برابر دہراتے رہے لیکن قوم کو نہ سننا تھا نہ سنا۔ ہم نے دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء میں ملک کے عام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی حکمت و صلاحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔

اس کے بعد قوم کی اخلاقی حالت کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

کسی قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام و تدابیر سے ہو سکتی ہے۔ ان کا مستقل علاج اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو۔ لہٰذا ہمارے جدید آئین میں اس امر کی بھی صراحت ہونی چاہیئے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہو گی اور اس کے بنیادی خط و خال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے "صحیح تعلیم" کہا ہے اس سے مقصود کیا ہے؟ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب محترم صدر مملکت نے پاکستان میں تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا تو ہم نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ہماری تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیئے لکھا۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و حکمت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہج زندگی اور فلسفۂ حیات اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اسی کو اسلام یا الدین کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا دین) کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہو گا؟ اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا۔ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے؟ اس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے؟ اور باقی عالم انسانیت کے لئے کیا (وغیرہ وغیرہ)۔ اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہو گی جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں میں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ اور نہ ہی وہ جس کا حاصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے بچوں کے ذہن میں دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا اور کوئی تصور مستحکم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (اور یونیورسٹیاں)۔ سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا اس سے غلط یا صحیح کچھ معلومات تو ہم پہنچ جاتی ہے دین کی روح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس۔ سو وہاں کے فارغ التحصیل علماء حضرات کو اسلام کے متعلق کیسی واقفیت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ نے میز کمیٹی کی تحقیقات کے دوران میں لگا لیا تھا۔ جب متعدد علماء سے پوچھا گیا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ تو ان میں سے بعض تو کہہ دیا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا اور جنہوں نے جواب دیا تھا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندر آج بھی موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوال پیش کر کیا جا سکتا ہے کہ "اسلام کسے کہتے ہیں اور اس کی غرض و غایت کیا ہے" جوابات خود بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتب و دار العلوموں میں اسلام کے متعلق کیس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں (وہ

بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں۔ تاکہ وہ امامت کی شرائط ادا کر سکنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نماز جنازہ پڑھا دی جائے جمعہ یا عیدین کا خطبہ دے دیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح وطلاق وغیرہ کے متعلق فتوے دے سکیں یا (جو تقریر کر سکتے ہوں وہ) دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کر سکیں۔ باقی رہا نفس اسلام تو وہ (مروجہ تعلیم کی رو سے) ان حضرات کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) حقیقی اسلام پہ غیر اسلامی تصورات ونظریات، معتقدات وخیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ انہوں نے انہی پردوں کو اصل اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک مسئلہ زیرِ نظر (یعنی تعلیم) کا تعلق ہے یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے یہاں "دینی" تعلیم مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس باب میں ہم میں اور اہل مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس کھلی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم منبر اور اسٹیج سے ہمیشہ پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست روح اور مادہ دین اور دنیا میں کوئی مغایرت نہیں اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہمارے ہاں عصر حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم ایک ہی درسگاہ میں دی جانی چاہیئے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ (INSTITUTION) کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد ہم نے بتایا تھا کہ ہماری صحیح تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا۔

اب رہا یہ کہ دین کی تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہو سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ دین کی اصل و بنیاد خدا کی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور جو تمام مسلمانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن ہی اس مقصود منتہیٰ کی وضاحت کریگا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہی بتائے گا کہ مسلمان کا فلسفۂ زندگی کیا ہے اور تعریفِ حیات کیا۔ اسی سے متعین ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ کا اقوامِ عالم میں مقام کیا ہے اور منصب کیا۔ یہی واضح کرے گا کہ مملکتِ پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے؟ یہی اس کی پالیسی کو متعین کرے گا اور اسی سے وہ شاہراہ حیات پر راہ نمائی حاصل کریگی۔ اس سے آگے بڑھئے تو اسی سے وہ کیرکٹر پیدا ہوگا جس کے فقدان کا ہم آج رونا رو رہے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ قرونِ اول کے جن مسلمانوں کے سیرت و کردار کو ہم نوعِ انسانی کے لئے بطور معیار اور مثال پیش کرتے ہیں۔ انہیں کس چیز کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہیں نبی اکرمؐ نے جو فقید المثال تعلیم دی تھی اسے خود کتاب اللہ نے ان چند الفاظ میں سمٹا دیا ہے کہ یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

الکتاب والحکمۃ (۲ : ۱۲۹)" وہ قوانین خداوندی کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کی ذات کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا ہے انہیں کتاب و حکمت (قوانین خداوندی اور اس کی غایت و علت) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وہ قرآنی تعلیم تھی جس نے اس اونٹ چرانے والی قوم کو اقوام عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا اہل اور مستحق بنا دیا۔ قرآن وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے احترام اور پابندی میں سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی مستقل اقدار وہ حدود ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کرنے کے مجاز قرار پاتے ہیں۔ انہی کے مطابق وہ معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں اولاً اس معاشرہ کے افراد کی زندگی اور اس کے بعد پوری نوع انسانی کی زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ہماری تعلیم کی اصل و اساس قرآن ہے۔ لیکن قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو یا سیرت، فقہ ہو یا روایات سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف علامہ اقبال نے آج سے کئی سال پہلے واضح الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ سر سکندر حیات خاں (مرحوم) نے تجویز کیا کہ شریعت کا بل اسمبلی کی طرف سے علامہ کی خدمت میں ایک تفصیلی پیش کی جائے۔ آپ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ملت کی ضروریات ایک فرد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اس کے بجائے آپ نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کرنا ہے تو اسلامیہ کالج میں اسلامیات کی ریسرچ کے لئے ایک ادارہ قائم کرو۔ اس سلسلے میں آپ نے فرمایا

"آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی فکر اور نہج زندگی کا ان کے حقیقی سرچشمہ کی روشنی میں مطالعہ کر کے قوم کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور کس طرح اس کے اہم تصورات و مباحث کا ان تہہ در تہہ پردوں کے بوجھ کے نیچے دب کر گلا گھٹ رہا ہے جو اسلام کے ضمیر پر بری طرح سے جم چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس (غیر اسلامی) تشر (CRUST) کو الگ کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کے ضمیر کو آزادانہ فطری نمو کا موقع مل سکے۔" (تقاریر و بیانات علامہ اقبال ؒ ص ۔۔۔)

تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں ہم نے کہا تھا۔

یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلباء کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطۂ حیات کی رو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس منتہیٰ کے حصول کا طریقہ کیا یعنی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں ہماری اور اسلامی فکر کی تاریخ بھی پڑھائی چاہیئے اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے اور تنقید کا معیار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے یعنی انہیں بتلانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق اور صداقت کے مطابق ہے۔ جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اسلامیات کی تعلیم اس انداز کی ہونی چاہیئے جس سے گورنمنٹ اسکولوں اور دینی دارالعلوموں کی ترتیب [illegible]

ختم ہو جانے۔ ایک اسلامی مملکت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کے جداگانہ کالج۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی یادگار ہے جو اب یہاں سے جا چکے ہیں۔

ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی (............) اس میں قرآن کریم کے عالمگیر غیر متبدل قوانین حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے ..... وہ اصول جو تکریم و حریت آدمیت، فرد کی ذات کی نشوونما، عالمگیر انسانیت کی وحدت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔

جہاں تک تعلیم کے اخراجات کا تعلق ہے ہم نے لکھا تھا کہ "تعلیم کی پوری ذمہ داری مملکت کے سر ہونی چاہیئے"۔

جب بچوں کی تعلیم مملکت کی ذمہ داری قرار پا جائے گی تو انفرادی اخراجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مملکت کی ذمہ داری یہ ہے کہ ہر بچہ وہ کچھ بن سکے کا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس میں ہے۔ کسی کی مضمر صلاحیتیں اخراجات کی کمی یا والدین کی وجہ سے دبی کی دبی نہیں رہ جائیں گی۔ صلاحیت کی نشوونما اس صورت میں دب کر رہ جاتی ہے جب ہر بچے کے ماں باپ پر اس کی تعلیم کا کفیل ٹھہرا دیا جائے۔ اس صورت میں صرف امیروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ دماغی طور پر کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں اور غریبوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں۔ لیکن جب پوری کی پوری نسل کی تعلیم کی ذمہ دار اسلامی مملکت ہو جائے گی تو پھر ہر بچہ تعلیم کی اس آخری منزل تک پہنچ سکے گا جس تک پہنچنے کی اس میں صلاحیت ہوگی ..... جو لوگ دن ملازمت کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یعنی تعلیم سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے متوسلین کی ضروریات زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ جمع کرتے ہیں کے لئے زیادہ کما سکیں۔ اس تعلیم کا جذبہ محرکہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا ..... اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما کا خیال اس کا جذبہ محرکہ قطعاً نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے لئے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ انہیں اس قدر دیا جائے جس سے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں اور وہ ان کی خاطر اس طرح پریشان نہ ہوتے پھریں۔ باقی رہا ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں جن میں وہ اپنے مضمر جوہروں کا مظاہرہ کر سکیں۔

آپ نے ان اقتباسات سے دیکھ لیا کہ ہمارے نزدیک قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم کا مسئلہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے اور اس کی طرف ہم کس طرح مسلسل و متواتر توجہ مبذول کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں، موجودہ حکومت سے پہلے کوئی اقدام نہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بچوں کی صلاحیتیں، صحیح تعلیم و تربیت کے ساحلوں کی عدم موجودگی میں پرسکون ندیوں کی بجائے حدود فراموش اور قیود ناآشنا سیلاب بنتی چلی گئیں جس کا نتیجہ آج ہم سب کے سامنے ہے۔ موجودہ حکومت نے سنہ ۱۹۵۹ء میں تعلیمی کمیشن مقرر کیا لیکن اس کا دائرہ تحقیق و سفارشات بڑا محدود تھا اس لئے اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا جس کی تصریح اوپر کی گئی ہے چنانچہ اس کمیشن کے تقرر پر ہم نے کہا تھا کہ

یہ ہے ہماری تعلیمی عمارت کا سنگِ بنیاد۔ اگر ہم نے فی الواقع ایسا تعلیمی نظام متشکل کرنا ہے جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے

تو اس کے لئے پہلا قدم یہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اس تعلیمی کمیشن کے محدود دائرہ تحقیق و سفارشات سے باہر ہے جس کا تقرر حال ہی میں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اس کے دائرہ تحقیق کی توسیع یا کسی دوسرے کمیشن کے تقرر کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور موجودہ نظام کے نظم و نسق میں تغیر و تبدل اور اس کے تکنیکی گوشوں میں اصلاح و ترقی تک محدود رکھا گیا تو (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی آرزو کے آئینہ دار محترم صدر مملکت کے وہ بیانات ہیں جن کے اقتباسات شروع میں زینت دو اوراق کئے گئے ہیں۔

چنانچہ جب کمیشن کی سفارشات سامنے آئیں تو ان سے ہمارے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ان کی سفارشات کا تعلق موجودہ طرز تعلیم کے انتظامی اور فنی گوشوں سے زیادہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ضرورت اس کی بنیادوں کو بدلنے کی ہے۔ ہم نے تجویز کیا تھا کہ اس کے لئے ایک الگ کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس لئے کہ

> یہ سوال اتنا اہم۔ اتنا وسیع اور اس قدر ہمہ گیر ہے کہ کوئی کمیشن ضمنی طور پر اس کے متعلق اطمینان بخش اسکیم مرتب نہیں کر سکتا۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۰ء)

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، نوجوانوں کی جس ذہنی آوارگی کے ہاتھوں ہم اس درجہ نالاں ہیں، وہ ایک دن کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ رفتہ رفتہ اس حد تک پہنچی ہے اور اس کی وجہ تعلیم کے مسئلہ سے ہمارا مجرمانہ تغافل ہے۔ ہمارے یہ موجودہ نوجوان وہی ہیں جو تشکیل پاکستان کے وقت آٹھ آٹھ، دس دس سال کے بچے تھے۔ یہ ان کی بارہ تیرہ سال کی غلط تعلیم و تربیت کا تدریجی نتیجہ ہے جو اب یوں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زہر صرف موجودہ کھیپ تک محدود نہیں، جو بچے ان کے پیچھے آ رہے ہیں وہ بھی تو اسی غلط تعلیم و تربیت کے پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ بھی انہی جیسے (بلکہ ان سے بدتر) ہوں گے۔ لہٰذا یہ کانٹے جن کی طرف سے ہم نے اتنے برسوں تک تغافل برتا ہے، نجانے کتنے عرصہ تک ہمارے پاؤں زخمی کرتے رہیں گے۔ ہمیں ان زخموں کی تکلیف کو طوعاً و کرہاً برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ضروری ہے کہ آئندہ کے لئے ایسا انتظام کیا جائے جس سے یہ صورت حالات دوام حاصل نہ کر جائے۔ اس کا علاج صحیح تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ قوم کے بچوں میں کیریکٹر اسی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر سوال سامنے آتا ہے کہ صحیح تعلیم سے کیریکٹر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ اس سوال کے تفصیلی جواب کے لئے آپ کو کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا جب طلوع اسلام میں اس موضوع پر شرح و بسط سے لکھا جائے گا۔ سر دست (مجملاً) اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کسی بلند اور اعلیٰ اقدار (VALUE) کی خاطر اپنے کمتر درجہ کی قدر کو قربان کر دینا، کیریکٹر کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مروجہ (غلط تعلیم) انسان کو محض حیوانی (طبیعی) سطح (PHYSIOAL LEVEL) کی زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ یہ اسے انسانیت کی سطح پر لاتی ہی نہیں۔ اس لئے اس کے سامنے حیوانی سطح سے بلند کوئی قدر ہی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم انسان کے سامنے زندگی کی بلند اقدار رکھتا ہے جن کی خاطر انسان حیوانی سطح کی پست اقدار کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

اب اس سوال کا دوسرا حصہ لیجئے۔ یعنی ہمارے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کس طرح ہوئی اور صحیح تعلیم اس کا علاج کس طرح کرے گی؟ اس کے لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ افرادِ معاشرہ کو حدود کے اندر رکھنے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ ایک کو کنٹرول (CONTROL) کہیئے اور دوسرے کو ڈسپلن (DISCIPLINE)۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر خارج سے پابندیاں عاید کی جائیں اور ان پابندیوں پر جبر عمل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان ان پابندیوں پر اسی وقت تک عمل پیرا رہتا ہے جب تک وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے جونہی جبر کی گرفت کمزور ہوئی، پابندیاں ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس، ڈسپلن ہے جس میں انسان اپنے آپ پر خود پابندیاں عاید کرتا ہے۔ وہ ان پابندیوں کی ضرورت اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے ان کی اہمیت اس کے اعماقِ قلب سے ابھرتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان پابندیوں کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھے جو پابندیاں اس طرح عاید کی جائیں یعنی وہ (SELF-IMPOSED) ہوں انسان انھیں کبھی نہیں توڑتا۔ آپ اپنے بچوں کو دیکھئے جس بچے کو آپ گھر میں جبراً پڑھنے کے لئے بٹھاتے ہیں اس کی ہر وقت یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ ذرا ادھر ادھر ہوں اور وہ کھیلنے کے لئے نکل بھاگے اس کے برعکس جس بچے کو احساس ہو کہ اگر اس نے محنت نہ کی تو وہ امتحان میں فیل ہو جائے گا اسے کام کرنے کے لئے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی وہ از خود زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرتا ہے کنٹرول اور ڈسپلن میں یہی فرق ہے۔

ہمارے (قدیم طرز کے) معاشرہ میں بچوں کی تربیت کنٹرول کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ ان سے اخلاقی اور حکماً منوائے جاتے تھے انھیں ان کی ضرورت اور اہمیت (یعنی غرض و غایت) کا دل سے قائل نہیں کرایا جاتا تھا۔ جب ہمارے کالجوں کی تعلیم نے ان میں تنقید کا مادہ ابھارا تو ان پابندیوں کی غایت ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس پر انہوں نے انھیں بے فائدہ جکڑبندیاں خیال کر کے ان کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس سے وہ انارکی (ANARCHY) پیدا ہو گئی جس نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ دوسری طرف بچوں کے والدین نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ گھر میں ان کی تربیت ڈسپلن کے طریق سے کی جائے جس سے بلند اقدار کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کی بلند اقدار سامنے نہ ہوں تو انسان حیوانی سطح سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتا۔ یہ وجوہات ہیں ہمارے بچوں کی موجودہ آوارگی کے۔

قرآن کریم کی صحیح تعلیم، زندگی کی بلند اقدار کو اس طرح اجاگر کرتی ہے کہ انسان انھیں علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا اور دل و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار میں وہ ڈسپلن ہو جاتا ہے جو کبھی آوارگی (انارکی) پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہی ہے وہ تعلیم جس کی طرف ہم شروع سے توجہ مبذول کرتے چلے آ رہے ہیں اور جس سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے معاشرہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قدر تلخ تجربے کے بعد بھی ہم اصلاحِ حال کے لئے کوئی موثر قدم اٹھانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ قوم میں تو ہمیں اس کے لئے کوئی آمادگی نظر نہیں آتی اس لئے ہم اپنی اس درخواست کو پھر دہراتے ہیں جسے ہم نے جنوری [illegible] میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

ہم محترم صدرِ مملکت کی خدمت میں با ادب لیکن بہ تاکید گذارش کریں گے کہ وہ قوم اور اسلام کی اس بنیادی ضرورت کو اپنی خصوصی توجہات کا

مرکز بنائیں اور اس کے لئے باقاعدہ انتظامات کریں تاکہ وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کا اظہار انھوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے اور جن میں مملکت کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انھوں نے تعلیم کو مشکل کر ان [illegible] لیا تو بلاشک وشبہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جائے گا اور قرطاسِ زمانہ پر ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی موجودہ آوارگی کی ذمہ داری قوم کے بڑے بوڑھوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں کیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان نوجوانوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرتے پھریں۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر قانون کو حرکت میں آنا چاہیئے اور معاشرہ کے فساد کا خاطر خواہ علاج کرنا چاہیئے۔ قانون کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ مجرم کی ابتدائی تعلیم و تربیت کس نہج سے ہوئی تھی وہ دیکھتا ہے کہ ملزم سے ارتکاب جرم ہوا ہے یا نہیں۔ یہ بحث اخلاقیات اور فلسفہ قانون و عدل کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے کہ اگر ہم اس امر کا تجزیہ کریں کہ قانون کہاں تک اس امر میں کہاں تک حق بجانب ہوتا ہے کہ وہ مجرم کے حال پر نگاہ رکھے اور اس کے ماضی کے نفسیاتی احوال و ظروف کو ارتکاب جرم کے لئے وجہ جواز تسلیم نہ کرے۔ اس بحث میں الجھنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ فطرت نے انسان کو بھی قوت ارادی کی [illegible] عطا کی ہے جو ماضی کے نفسیاتی احوال و ظروف کے اثرات پر غالب آسکتی ہے۔ اس لئے اگر ہمارے موجودہ نوجوان ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیں تو اپنی حالت کی بآسانی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اب وہ عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جہاں وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ تمیز کرنے کے بعد ان رجحانات و میلانات پر بآسانی قابو پا سکتے ہیں جو انھیں ارتکاب جرم یا آوارگی پر آمادہ کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کر لیں تو یہی ہماری اس قدر گراں بہا متاع بن جائیں گے جس پر قوم فخر کرے گی۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے وہ صرف ان بے راہ رو نوجوانوں سے متعلق ہے جو بدقسمتی سے غلط روش پر چل نکلے ہیں۔ ورنہ قوم میں ایسے نوجوانوں کی بھی کمی نہیں جن کی شرافت و نجابت پر ہم جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کا پورا طبقہ ہمارے لئے باعث فخر و عزت بن جائے۔ اسی میں ملت کی فلاح و فوز کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم　　کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا　　انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

قوم کی تقدیر ابھرنے والی نسل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

کراچی کے دوستو!

آؤ اور ہر اتوار کی صبح ۹ بجے سندھ اسمبلی ہال (متصل سینٹرل ہوٹل) بندر روڈ میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بات مفکر قرآن کی زبان سے ———　(بزم طلوع اسلام کراچی کے زیر اہتمام)

علامہ احمد امین مصری (مرحوم)

کی علمی و تاریخی کاوشوں کا شاہکار!

—— اور ——

"اسلام کی سرگذشت" کے سلسلۂ دراز کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

(جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اُردو زبان کا لباس پہنایا)

منظر اشاعت پر آگئی

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب کہ آفتاب اسلام کی جلوہ

باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا ——

ضخامت:۔ نو سو صفحات —— قیمت:۔ آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ طلوع اسلام، ۲۷۔بی، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

پرویز صاحبؒ کی گرانمایہ تصنیف

سلیم کے نام

خطوط

اہم عنوانات

- علماء کون ہیں؟
- تصوف کی تاریخ
- صوفیائے کرام
- قرآن اور تصوف
- قوموں کے تمدن پر جنیات کا اثر
- تقدیرِ امم
- ..... فقط ایک بار دیکھ لے
- ہماری تاریخ
- اسلام آگے کیوں نہ چلا؟
- ضبطِ ولادت

تیسری جلد بھی شائع ہو گئی

جلد اول و دوم کے بعد اس تیسری جلد کی اشاعت نے قرآنی فکر و بصیرت کے اہم تقاضوں کو حسین ترین انداز میں پورا کر دیا۔ یہ خطوط نوجوانانِ ملت کے قلب و نگاہ کو رشد و ہدایت کی نئی روشنی عطا کریں گے۔

ضخامت ساڑھے چار سو صفحات ——— قیمت:- چھ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

اسلام میں فرقے

سابقہ ماہ (اگست) کے طلوعِ اسلام کے لمعات سامنے لائیے۔ ان میں ہم نے بتایا تھا کہ موقر معاصر الاعتصام (لاہور) نے اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ مولانا محمد حنیف ندوی صاحب کا ایک گرانقدر مقالہ شائع کرے گا جس میں ثابت کیا جائے گا کہ اسلام میں سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقے ضرور رہنے چاہئیں۔ اس مقالہ کی قسط اول الاعتصام بابت ۲۲ جولائی میں شائع ہوئی ہے جس کا تعلق سیاسی پارٹیوں سے تھا۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت اگست میں اس قسط کا مختصر سا جائزہ لے کر بتایا تھا کہ ندوی صاحب کا مقالہ کس قدر سطحی اور دین و سیاست سے بے گانگی و لاعلمی کا غماز ہے۔ ۹ جولائی کو اس مقالہ کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کے فرقوں سے بحث کی گئی ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم زیرِ نظر اشاعت میں مقالہ کی صرف اسی قسط کا جائزہ لیں گے۔ لیکن اس دوران میں اکثر قارئین کی طرف سے تقاضا ہوا ہے کہ ندوی صاحب کے مضمون کی قسط اول بھی طلوعِ اسلام میں شائع کر دی جائے تاکہ قارئین کے سامنے پورا سلسلہ آ جائے۔ اس مطالبہ کے پیشِ نظر ہم پہلے قسط اول شائع کرتے ہیں۔

تمہیدی نوٹ مقالہ کے شروع میں الاعتصام نے ایک تمہیدی نوٹ میں ندوی صاحب کی علالت اور مقالہ کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ۹ جون ۱۹۵۹ء کو مولانا محمد حنیف صاحب ندوی کے قلب پر حملہ ہوا تھا۔ اس سے افاقہ ہوا تو آپ کو اعصابی کمزوری اور تبخیرِ معدہ کی دوہری بیماری نے آ گھیرا۔ ان بیماریوں کا حملہ نہایت شدید تھا۔ چلنے پھرنے، پڑھنے لکھنے اور گفتگو کے قطعی قابل نہ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ کسی کی بات سننے اور اس کی طرف دیکھنے تک سے تکلیف ہوتی تھی۔ میل جول وغیرہ سب بند تھا۔ اب مولانا کو بحمد اللہ بہت افاقہ ہے اور آپ روبصحت ہیں۔
>
> بیماری کے بعد یہ پہلا مضمون ہے جو مولانا نے "الاعتصام" کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کی صحت ابھی اس قابل نہ تھی

کہ ان کو یہ تکلیف دی جاتی۔ لیکن موضوع کی اہمیت اور مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر یہ ناگزیر تھا۔ ہم مولانا کے نہایت شکر گزار ہیں کہ مضمون کے لئے ان کی خدمت میں عرض کیا گیا تو فوراً آمادہ ہو گئے۔ اور ہماری گزارش کو شرفِ قبولیت بخشا۔ حالانکہ ابھی ان کی طبیعت بھی کمزور ہے اور وہ بحالیٔ صحت کی غرض سے کوئٹہ تشریف لے جانے کے لئے بھی رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ مولانا موصوف نے یہ مضمون بڑی جلدی میں لکھا ہے اور دو قسطوں پر مشتمل ہے۔ آج کی قسط میں سیاسی جماعتوں کے وجود اور طرزِ حکومت پر بحث کی گئی ہے۔ آئندہ قسط میں یہ بتایا گیا ہے کہ مذہبی فرقے کیونکر پیدا ہوئے۔ اس کا کیا پس منظر ہے اور کیا منطقی وجوہ ہیں جو انہیں عالمِ وجود میں لائے۔ مضمون کا دوسرا حصہ بڑا علمی اور تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ پرویز صاحب نے قرآن کے نام سے انکارِ حدیث کی جو تحریک شروع کر رکھی ہے اور لوگوں میں جہالت اور ذہنی و فکری انتشار پیدا کرنے کا جو علم بلند کر رکھا ہے اور مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی بندش کے پردہ میں جس فسطائیت اور اشتراکیت کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اہلِ علم کا فرض ہے کہ اس کا پوری ہمت سے مقابلہ کریں اور اس تحریک کا جو تمام وجوہ سے غلط ہے اچھی طرح تعاقب کریں۔ اس سے چشم پوشی ملک میں فسطائیت اور اشتراکیت کے فروغ کا باعث بنے گی۔

ہم مولانا محمد حنیف ندوی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے کمزوریٔ صحت کے باوجود اس تحریک کے خلاف قلم کو حرکت دی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کو صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے اور آپ اللہ کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ (مدیر)

اس کے بعد ندوی صاحب کا مقالہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے سرِ عنوان انہوں نے یہ اقتباس دیا ہے۔

تہذیب و تمدن کی اس دنیا میں محبت و اختلاف کے دو گونہ عناصر کو پہلو بہ پہلو رہنا چاہیئے۔ کیونکہ زندگی بحیثیت مجموعی اس بوقلمونی کی متقاضی ہے۔ یہی نہیں ہمارے طبعی حالات اور تہذیبی خد و خال اس حقیقت کا مظہر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جہاں تک محبت و اختلاف کے نقوشِ رنگا رنگ کا تعلق ہے ان کو جبینِ انسانیت کی زینت سمجھئے۔ ڈی ایچ کول

محبت اور اختلاف

اس میں شبہ نہیں کہ "محبت اور اختلاف"[1] دو الگ الگ عناصر ہیں جو دنیا میں موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ محبت کے تعلقات کن لوگوں سے وابستہ ہوں گے اور اختلاف کن سے؟ قرآن کریم نے اس کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ جو لوگ ایمان کے رشتے میں منسلک ہوں گے ان میں باہمی محبت و الفت اور اخوت و مودت کے تعلقات ہوں گے۔ اور جو لوگ اس رشتہ کی مخالفت کریں گے ان سے بُعد و اختلاف ہو گا۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) کی خصوصیات اسی بنیادی اصول کی مظہر ہیں۔ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳) اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی اور

---

[1] چونکہ صاحبِ مضمون نے محبت کے مقابل میں اختلاف کا لفظ لکھا ہے اس لئے ہم نے بھی اسے ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ ورنہ محبت کے مقابل عداوت اور اختلاف کے مقابل اتحاد یا اتفاق کے الفاظ آنے چاہئیں۔

تمہیں اپنی نعمت سے بھائی بھائی بنا دیا۔" جماعت مومنین کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔ لہٰذا وہ "اختلاف" جو محبت کا نقیض ہے جماعت مومنین کے اندر رہ نہیں سکتا۔ اس قسم کے اختلاف کو خدا نے "عذاب عظیم" کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا یہ "جبین انسانیت کی زینت" نہیں ہو سکتا۔

یہ تھی قرآن کریم کی رو سے "محبت اور اختلاف" کی پوزیشن۔ لیکن ندوی صاحب اس اقتباس کو یہ ثابت کرنے کے لئے بطور سند پیش کر رہے ہیں کہ خود جماعت مومنین (امت مسلمہ) کے اندر "محبت اور اختلاف" کے گوناگوں عناصر رہنے ضروری ہیں۔

اختلاف کا مفہوم

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ایک چیز ہے انسانی خیالات اور آراء کا مختلف ہونا، اور دوسری چیز ہے مسالک و مشارب کا مختلف ہونا۔ دین کے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے پہلی قسم کا اختلاف مضرت رساں نہیں بلکہ اس سے مفید نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ باہمی مشاورت (شوریٰ بینہم) اسی اختلاف آراء و خیالات سے مفید نتائج مرتب کرنے کے لئے ہے۔ لیکن اختلاف مسالک (یعنی مختلف گروہوں کا الگ الگ راستہ اختیار کر لینا) وہ طریق عمل ہے جسے قرآن عذاب خداوندی قرار دیتا ہے اور جس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ اسی کو وہ اَلسُّبُلَ (مختلف راستوں) سے تعبیر کرتا ہے جہاں (نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے) کہلاتا ہے کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (۶/۱۵۳) "ان سے کہہ دو کہ یہ ہے میری سیدھی راہ۔ سو اس پر چلو۔ اور مت چلو اور راستوں پر کہ وہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستے سے۔" یہ ہے وہ اختلاف مسالک (یعنی امت کے افراد کا مختلف راستوں پر چل نکلنا) جس سے روکا گیا ہے۔ لہٰذا "اختلاف آراء" کے وجود سے "اختلاف سُبل" کے حق میں دلیل لانا علم اور دین دونوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ "اختلاف آراء" سے مفہوم یہ ہے کہ (مثلاً) کوئی معاملہ زیر غور ہے۔ امت کے نمائندگان اس کے متعلق اپنی اپنی آراء آزادانہ پیش کرتے ہیں۔ اس پر بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے مختلف گوشے ابھر اور نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں (اسے مشاورت کہتے ہیں)۔ اس اختلاف کی قطعاً ممانعت نہیں۔ اس کے بعد اس معاملے کے متعلق فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ تمام افراد امت پر یکساں نافذ ہوگا۔ اگر وہ افراد جو اس فیصلے کے خلاف رائے رکھتے تھے اپنے ہی فیصلہ پر عمل پیرا ہونے پر اصرار کریں اور اس طرح دوسری راہ پر چل پڑیں، تو یہ اختلاف مسالک و تفریق سُبل ہوگا جس کی دین خداوندی میں قطعاً اجازت نہیں۔

"اختلاف" اور "افتراق" کے اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ندوی صاحب کا مقالہ

اس کے بعد ندوی صاحب کا مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ چونکہ ہم ان کے مقالہ کے اس حصہ (قسط اول) پر (اگست سنہ ۱۹۶۷ء کے طلوع اسلام میں) تبصرہ کر چکے ہیں اس

لئے اس کے مختلف اجزاء کو الگ الگ پیش کر کے ان پر تنقید کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم اس کے آخر میں صرف اصولی طور پر اپنے سابقہ تبصرہ کو دہرا دینے پر اکتفا کریں گے۔ وہ فرماتے ہیں۔

مثال ہی میں ایک پمفلٹ کے ذریعے پرویز صاحب نے اس حقیقت کی پردہ کشائی فرمائی ہے کہ پاکستان میں تمام دینی و سیاسی فرقوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ از روئے قرآن مسلمانوں کا فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہو جانا شرک و کفر کے مترادف ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ایک ملت کی حیثیت میں مسلمانوں کو رہنا چاہیئے۔ اور تو اور اہل السنت کے تمام فرقوں کو بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔

اللہ اللہ قرآن بھی کس درجہ مظلوم صحیفہ ہے۔ اس میں سے جو چاہے نکال لیجئے اور اس کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں چاہے کتنے ہی مہملات کا اظہار کر لیجئے کوئی روکنے اور ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

یہ دعویٰ سیاسی اور دینی نقطہ نظر سے بجائے خود ایسا تھا کہ اول دہلہ میں اس کو یکسر غیر منطقی اور غلط سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ اور قطعی درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا۔ مگر اس سطحیت، اتھلے پن اور سادگی کا ماتم کیجئے کہ لوگ ہر جدت طرازی پر جوم جانے اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسا دینے کے عادی ہیں۔ اس لئے بدرجۂ اضطرار مسلمات اور درخشاں و تابناں حقائق کو بھی تھوڑی دیر کے لئے مابہ النزاع مان لینا پڑتا ہے اور اس کے بارے میں بھی بہرحال بحث و تمحیص کے پیمانوں کو حرکت دینا ہی پڑتی ہے۔ یہ مجبوری ہماری نہیں اس دور کی مجبوری ہے۔ جس میں علمی و دینی اقدار کے بارے میں کچھ جاننے اور معلوم کرنے کی کوشش کرنا گویا وقت ضائع کرنا ہے۔ ہر شخص مادیت کے چکر میں اس طرح گرفتار ہے کہ زندگی کے اہم مسائل پر توجہ صرف کرنے کی اُسے فرصت ہی نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسے نازک معاملات میں غور و فکر کی تمام ذمہ داریوں کو چند پیشہ ور عطائیوں نے سنبھال رکھا ہے۔ جن میں نہ دیانت داری ہے نہ خدا کا خوف ہے اور نہ جنھیں اپنے منصب ہی کی اہمیتوں کا احساس ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا پرویز صاحب کی اس اعجوبہ زائی کی جس کا ہم نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے علم سمجھ بوجھ اور قرآن حکیم کی تعلیمات سے تائید ہوتی ہے؟ پہلے اس مسئلہ کے سیاسی پہلوؤں کو لیجئے۔

جب کوئی شخص پارلیمانی طرزِ حکومت کی تائید کرتا ہے تو اس کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اور ذہن و فکر میں جمتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص صدارتی انداز کی حکومت کی سفارش کرتا ہے تو اس میں بھی اچھا خاصا وزن محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس دور اور عصر کے جمہوری تقاضوں کی تکمیل انہیں دو نظاموں اور اداروں سے ہو پاتی ہے۔ لیکن جب کوئی شخص ان دونوں سے ہٹ کر صدارتی نظام کی تائید اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ ملک میں کوئی اپوزیشن کرنے والی پارٹی زندہ نہ رہے تو اس کی یہ بات پولیٹیکل سائنس کی اصطلاح میں یا تو بالکل مہمل اور بے معنی قرار پائے گی اور یا پھر اس کا نتیجہ کھلی ہوئی فسطائیت ہوگا۔ جس کو کوئی شریف النفس انسان از سر نو نافذ کرنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ فسطائیت میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے تک تو بلاشبہ جذب و کشش کے اسباب پائے جاتے تھے۔ مگر اس زمانے میں جب تجربے اور خود اس جنگ نے جمہوریت کی فتح پر مہر

تصدیق ثبت کر دی ہے اس کا نام لینا بھی بڑے درجے کی رجعت پسندی ہے۔

یہ بات پرویز صاحب سے پوچھنے کی نہیں۔ نہ اس سلسلہ میں ان کے فتویٰ کی کوئی حیثیت ہے۔ اس کو کالج کے کسی برخوردار سے پوچھ لینا کافی ہے جس نے سیاسیات کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہو۔ کہ جس نظام حکومت میں اختلاف رائے کو جرم قرار دیا جائے وہ کسی درجے میں بھی صدارتی نظام کہلائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے؟ کیا امریکہ میں جو اس نظام کا بہترین گہوارہ ہے، کوئی اس منطق کو سمجھ سکتا ہے کہ صدر در آمر دونوں ایک ہی حقیقت کے پرتو ہیں۔ اور کیا ایسا نظام آخر آخر میں بالکل وہی شکل اختیار نہیں کرے گا جس نے اٹلی اور جرمنی میں وہ طوفان بدتمیزی برپا کیا تھا جس پر خود ان ملکوں میں ندامت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

روس کے نظام آمریت کو اس سلسلہ میں اپنے سامنے رکھنا اور وحدت فکر یا آئیڈیالوجی کی یکسانی کو بطور مثال کے پیش کرنا بیک وقت دو غلطیوں کا مرتکب ہونا ہے۔ اول یہ کہ روسی نظام اشتراکیت کی یہی ادا جمہوریت پسند طبقوں میں سب سے زیادہ قابل اعتراض ہے۔ ورنہ جہاں تک معقول قسم کے سوشلزم کا تعلق ہے اس کی مداحی میں خود انگلستان کے بڑے بڑے حکماء اور فلسفی پیش پیش ہیں۔ دوسرے یہ کہ قرآنی تعلیمات اس مسئلہ میں دو ٹوک اور فیصلہ کن موقف رکھتی ہیں۔ ان میں مشورہ اور شوریٰ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔ وامرھم شوریٰ بینھم (اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں) جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کی اطاعت غیر مشروط ہو۔ یہی وجہ ہے دوسری جگہ " فان تنازعتم " کہہ کر خود قرآن نے خلفاء وصاحب امر حضرات سے اختلاف کی اجازت بخشی ہے۔ لطف یہ ہے کہ تنہا اسی جمہوری تعلیم کی مناسبت سے جس کو اس میں واضح کیا گیا ہے۔ اس صورت کا نام شوریٰ رکھا ہو۔ حالانکہ یہ اس سورۃ کی ترپن آیات میں سے صرف ایک ہی نہیں بلکہ پوری آیت کا محض چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ سورۂ آل عمران میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے وشاورھم فی الامر (تنظیمی واصلاحی معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو) اس مرحلہ پر پرویز صاحب کو اصول فقہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہم یاد دلاتے ہیں۔ جو بات فی ذاتہ حسن اور بہتر ہو اس کے لوازم واسباب کو بھی حسن اور بہتری کے حکم میں سمجھا جائے گا۔ یعنی اگر مشورہ طلبی ایسی اہم بات ہو کہ اس کے نام پر پوری ایک سورت کو معنون کیا جا سکتا ہے اور پیغمبر کو باوجود وحی ربانی سے متصف ہونے کے حکم دیا جا سکتا ہے کہ تنظیم واصلاح کے دائروں میں وہ باہمی مشورے سے کام لیا کریں۔ تو اس کا لازمی اور منطقی مفہوم یہ ہے کہ جن جن اسباب وسائل سے مشورہ وشوریٰ کے مقاصد کی تکمیل ہو گی اور جن جن اداروں اور تنظیمات سے اس کی روح کو زندہ رکھنے اور چمکانے کے مواقع میسر ہوں گے ان کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھنا از روئے قرآن مستحسن اور بہتر ہو گا بلکہ ان اداروں کو ایسی شکل میں ڈھالنا جن سے مشورہ طلبی کی افادیت اور بڑھ جائے۔ عین منشائے الٰہی ہو گا۔ کہیئے جمہوریت کوئی اس سے مختلف شے ہے۔

پرویز صاحب کے اس دعویٰ کا ایک اور پہلو سے جائزہ لیجئے۔ کیا صدر مملکت اور حکومت کے سربراہ متعدد بار اعلان

نہیں کر چکے ہیں کہ وہ اختیارات عوام کو سونپنا چاہتے ہیں اور قطعی کسی نوع کی آمریت یا استبداد کے حامی نہیں۔ خود دستور ساز ادارہ نے جو سوالنامہ شائع کیا ہے اس میں سوالات کے انداز سے کیا کھلے بندوں معلوم نہیں ہوتا کہ حکومت کا جو نقشہ پرویز صاحب کے سامنے ہے، وہ بالکل خارج از بحث ہے۔ کیونکہ دستور ساز ادارہ نے پوچھا صرف یہ ہے کہ جمہوریت کی دو رائج شکلوں میں سے آپ کس شکل کو زیادہ بہتر، زیادہ قابل عمل اور مفید دستور قرار دیتے ہیں۔ پارلیمانی شکل کو یا صدارتی شکل کو؟ اس صورت میں پرویز صاحب اختلاف رائے کے ابتدائی اور بنیادی حق کو چھین کر کیا حکومت کے عزائم کی غلط ترجمانی نہیں کرتے؟

یہاں ایک لطیفہ ملاحظہ فرمایئے جو لطیفہ بھی ہے اور پرویز صاحب کے تناقضات کا شاہکار بھی۔ یہ حضرت نشریات میں تو مشورہ کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں ہر اس بات کو دینی مان لیا جائے جو قرآنی معاشرہ میں باہمی مشورہ سے طے ہو۔ مگر اسی معاشرہ کو یہ سیاسی اور انسانی حق دینے کو تیار نہیں۔ کہ یہ نیک نیتی سے اختلاف رائے کا اظہار کر سکے یا حقیقی اور صحت مند اختلاف کی بنیاد پر کوئی اپوزیشن قائم کر سکے۔ دین کے معاملہ میں یہ ذہنیت اور سیاسیات میں یہ تنگ نظری! آپ بتایئے اس بوالعجبی کا کوئی جواب ہے؟

محض دھوکہ دینے کے لئے پرویز صاحب اس مرحلہ پر خلافت راشدہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہاں کسی اپوزیشن کا ثبوت ملتا ہے؟ اور کیا اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے دور میں کسی مخالف پارٹی کو گوارا کیا تھا؟ جو ہم کریں۔ اس مثال میں کیا گھپلا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لئے ہم چند نکات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ خلافت راشدہ۔ قیادت و رہنمائی کی ایسی سادہ اور روحانی شکل ہے جس کو کسی معنی میں موجودہ اصطلاحات کی روشنی میں حکومت یا اسٹیٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خدوخال اور خصوصیات سے اگر کسی نظام حکومت کی تائید ہو سکتی ہے تو وہ جمہوریت ہے نہ کہ شخصیت۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ پیش کرتے ہیں جس کے ایک ایک لفظ سے بہترین اور اعلیٰ درجہ کی شورائی حکومت کا تصور مستنبط ہوتا ہے۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ خلافت راشدہ یا صحابہ کا اسوہ صرف سیاسیات کی حد تک حجت ہے یا پرویز صاحب کے نزدیک اُن کا عقیدہ، ان کا آنحضرتؐ سے لگاؤ اور عشق، ان کی اطاعت رسول، اور سنت کی والہانہ پیروی بھی اس لائق ہے کہ اس کو اپنے فکر و عمل کا جزو ترکیبی بنایا جائے۔

۳۔ یہ صحیح ہے کہ خلافت راشدہ میں کوئی باقاعدہ اپوزیشن نہیں تھی مگر اختلاف رائے اور اس کے احترام و توقیر کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اپوزیشن ہی پر کیا موقوف ہے اور بہت سی چیزیں نہیں تھیں۔ یعنی خلیفہ کے اختیارات متعین نہیں تھے۔ شوریٰ کے حقوق و فرائض متعین نہیں تھے۔ طریق انتخاب واضح نہیں تھا۔ تنخواہ دار فوج نہیں تھی۔ باقاعدہ میزانیہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ آج کل کے پیچیدہ معاشرہ میں ان چیزوں کو نہیں ہونا چاہیئے۔

یہاں تک بحث و نظر کا انداز علمی تھا۔ ایک علمی حقیقت پیش کرنے کے بعد ہم بحث کے دینی پہلوؤں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ پاکستان میں رہنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستان کو منصۂ شہود پر لانے والی جماعت مسلم لیگ ہے۔ سوال یہ ہے کہ خود اس مسلم لیگ نے کبھی اختلاف رائے کو بحیر خم کرنے کی کوشش کی؟ آپ اس کی دوسری قباحتوں اور کمزوریوں کی ضرور نشاندہی کیجئے۔ اس کی نااہلی اور عدم تدبر کی مثالیں قطعی پیش کیجئے۔ ہم اس میں آپ سے پورا پورا اتفاق کریں گے۔ لیکن اس کی اس خوبی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے بھی موجودہ حکومت کی طرح اپنے عہد اقتدار میں اختلاف مسلک و رائے کو پوری وسعت قلبی سے برداشت کیا ہے۔ یہی نہیں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ قائداعظمؒ کی زندگی میں ان کی پوری پوری تائید اور منظوری سے لیگ نے حکومت کا جو ڈول ڈالا تھا وہ قطعاً اس نقشے سے مختلف ہے جس کو پرویز صاحب پیش کرتے ہیں۔ پرویز صاحب کا یہ نقشہ اس نقشہ سے بھی مختلف ہے جو موجودہ حکومت چاہتی ہے اور جس کا وہ بار بار اعلان کر چکی ہے۔

عوام بھی اس کے حامی نہیں۔ پاکستان کے اہل عقل و علم بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان پر فسطائیت ٹھونس دی جائے اس صورت میں، اس منصوبے کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یعنی اختلاف رائے اور ہر معاملہ میں حکومت کے ساتھ تعاون و اشتراک کے اس انسانی حق کو کون چھینے گا اور کیوں؟ پھر اگر اسے عملی حیثیت سے اس انجمن طرازی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اور یہ محض ایک لغو آرزو، ایک بے معنی مطالبہ اور انوکھی تجویز ہے۔ تو اس سے کیا فائدہ؟

آخر میں یہ کہہ کر ہم بحث کے اس پہلو سے عہدہ برآ ہوتے ہیں کہ جمہوریت اس دور کی وہ اہم سیاسی قدر ہے جس کے لئے ماضی میں انسانیت نے بیش از بیش قربانیاں پیش کی ہیں اور جس کے نفاذ اور ارتقاء کے لئے پاکستان، انڈیا، پورا مغرب امریکہ اور تمام انسانیت دوست حلقے اخلاص کے ساتھ کوشاں ہیں۔ بلکہ پوری مہذب دنیا میں یہ رائج ہے اور اس کے حدود کو چار و ناچار اشتراکی ممالک اور اشتراکی ریاستوں تک وسیع ہونا ہے۔ گویا یہ مسئلہ محض فکری نظری بحث و تمحیص، اور جدل و مناظرہ کی چیز نہیں کہ اس سے مدت ہوئی دنیائے انسانیت فراغت حاصل کر چکی ہے۔ اسے یہ ایک عملی حقیقت، ایک زندہ اصول اور جیتی جاگتی سیاست سے تعبیر ہے جو اس وقت بھی بحمداللہ پاکستان میں نافذ ہے اور پوری شان دلبری کے ساتھ جسے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک متعین شکل اختیار کرنا ہے۔"

اس مقام پر ہم صرف اتنا اور بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے سامنے چونکہ مغرب کا جمہوری نظام ہے (اور اسی کو انھوں نے اسلامی نظام سمجھ رکھا ہے) اور اس نظام میں پارٹیاں موجود ہوتی ہیں، اس لئے ان کا خیال ہے کہ جس نظام میں پارٹیاں نہ ہوں وہ جمہوری نہیں ہوتا، فسطائیت، آمریت، اشتراکیت (اور نہ معلوم کیا کچھ) ہوتا ہے۔ اور اس میں اختلاف آراء اور آزادی خیال کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ خیال قرآنی نظام جمہوریت سے بے خبری پر مبنی ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد امت کو (دین کی حدود کے اندر) آزادی خیال اور اختلاف رائے کے اظہار کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ مغربی نظام میں اس آزادی کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ مثلاً اس میں

(۱) اکثریت پر مشتمل پارٹی حکومت قائم کرتی ہے۔ یہ پارٹی حکومت کے فیصلہ یا عمل پر تنقید نہیں کر سکتی۔

(۲) اقلیت حزب مخالف قائم کرتی ہے اور اس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے ہر فیصلہ یا عمل پر تنقید کرے تاکہ وہ بدنام ہو جائے اور زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(۳) پارٹی کے ارکان کو اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق نہیں ہوتا۔ ان کے لئے پارٹی کے فیصلوں کا اتباع کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ پوری امت کا ایک وحدت رہنا، اسلامی تعلیم کے مطابق ہے یا اس کا پارٹیوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہنا، قرآنی تصور کے مطابق ہے؟ پارٹیوں کے متعلق خدا کا ارشاد ہے

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ ..... (۶/۶۵)

(ان سے) کہو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے۔ یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا تمہیں پارٹیاں بنا کر ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تم میں سے ایک دوسرے کو لڑائی کا مزہ چکھائے۔

غور کیجئے کہ جس پارٹی بازی کو قرآن اللہ کا عذاب قرار دیتا ہے۔ یہ حضرات اسے خدا کی رحمت بتلاتے ہیں! قرآن امت کی وحدت پر زور دیتا ہے۔ وہ ہر فرد امت کو آزادی خیال و رائے کا پورا پورا حق دیتا ہے۔ وہ مشاورتی نظام رائج کرتا ہے جس میں کوئی پارٹی نہیں ہوتی۔ اور ارباب حل وعقد کے اختیارات کو دین کے اصولوں کی چار دیواری میں محدود کر کے آمریت کی کسی شکل کو ابھرنے نہیں دیتا۔

مذہبی فرقہ

اب ہم ندوی صاحب کے مضمون کی دوسری قسط کی طرف آتے ہیں۔ جس میں انہوں نے مذہبی فرقوں سے بحث کی ہے۔ یہ حصہ بڑا اہم ہے۔ اس لئے کہ اسی کے لئے الاعتصام نے طبل وعلم کی معیت میں یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اور اس کا ہمیں بھی انتظار تھا کہ دیکھیں کہ جناب ندوی، کن نصوص و دلائل سے فرقہ بندی کو عین اسلام ثابت کرتے ہیں۔ سو لیجئے۔ وہ مضمون حاضر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم دینی نقطہ نظر سے پرویز صاحب کے اس موقف پر اظہار خیال کریں، اور

اسلام میں مختلف فرقوں کے پس منظر کی وضاحت کریں۔ اور بتائیں کہ کلامی، فقہی اور متصوفانہ رجحانات کیونکر تکمیل و اتمام کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ دو تین اہم نکتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلا غور طلب مسئلہ سوال جو اس سلسلہ میں ابھر کر سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جبر اور حکومت کے زور سے مسلمانوں میں مروجہ مدارسِ فکر کو ختم کر دینا آیا خود قرآن کی رُو سے جائز بھی ہے یا نہیں۔ سورہ بقرہ کی یہ مشہور آیت تو یقیناً نظر سے گذری ہوگی۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت صاف طور پر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے

جب قرآن دین کے معاملہ میں زبردستی کو جائز نہیں ٹھہراتا تو آپ کی اس دھاندلی کے لئے کیا وجہ جواز ہے کہ ان تمام دینی فرقوں کو مٹا دیا جائے، جنھوں نے صدیوں اور جزوی اختلاف کے ساتھ ساتھ فقہ و کلام اور تصوف و معارف کی دولت میں بیش بہا اور قابلِ قدر اضافہ بھی کیا ہے۔ اسلامی ذہن و فکر کو تازہ خون بھی بخشی ہے اور غور و فکر کی سطحوں کو اونچا بھی اٹھایا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی رواداری تو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کفار سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جائے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینی ہی یہ ٹھہراتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کے پہلو بہ پہلو کفر کی یہ مختلف شکلیں بھی قائم رہیں تاکہ حق و باطل میں جو محسوس فرق ہے اور کفر و اسلام کے نتائج میں جو مابہ الامتیاز ہے اس کو یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور اپنے عقیدہ و فکر کی گمراہیوں کو علیٰ وجہ البصیرت بھانپ سکیں۔

ولو شاء اللہ لجعلھم امۃ واحدۃ

اگر خدا چاہتا تو ان کو ایک ہی امت کی صورت میں ڈھال دیتا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو اسلام اپنے دائرہ سے باہر کفر کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر ان مدارسِ فکر کو کیوں برداشت نہیں کرتا جن میں اختلاف بنیادی نہیں محض فروعی اور تشریعی ہے۔

تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ

یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہوئی

ایک سوال ہم محترم ندوی صاحب سے اتنا دریافت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا آپ فرمائیں گے کہ طلوع اسلام نے کب اور کہاں یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کے فرقوں کو حکومت کا جبر مٹا دے؟

اور اگر آپ یہ نہ دکھا سکیں (اور آپ کبھی نہیں دکھا سکیں گے) تو کیا آپ کبھی اپنے ضمیر سے یہ پوچھیں گے کہ لوگوں کو اس قدر

کھلا ہوا دھوکا دینا کس حد تک جائز ہے؟

سنئے! ہم آپ کو بتائیں کہ طلوع اسلام نے اس باب میں کیا کہا ہے؟ اس نے (آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں) سیاسی پارٹیوں کے متعلق یہ کہہ کر کہ "ان پارٹیوں کو پاکستان میں قطعاً ممنوع قرار دیدینا چاہیئے" یہ لکھا ہے کہ

(اصولی طور پر) جو کچھ سیاسی پارٹیوں کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق مذہبی فرقوں پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن ان دونوں میں فرق نہیں کرتا۔ لیکن مذہبی فرقوں کا مسئلہ ایسا نازک ہے جسے قانون کی رُو سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں تعلیم و تربیت کا ایسا نظام قائم کیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں میں وسعت پیدا کر دے۔ فرقوں کے مسئلہ کو اس کا بہرحال انتظار کرنا ہوگا۔ اگر ہمارا آئین قرآنی خطوط پر متشکل ہو گیا تو اس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں ایسی خوشگوار فضا پیدا ہو جائے گی جس سے اختلافات مٹتے جائیں گے اور ملت ایک مستحکم وحدت میں تبدیل ہو جائے گی۔

پھر اس نے (اپنے پمفلٹ 'کتاب و سنت' میں علمائے کرام سے تخاطب کرتے ہوئے) لکھا۔

ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں۔ اسے بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے شبانہ شب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو مردِ دست اضطراری طور پر گوارہ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو اس "مشرکانہ حالت" سے نکل کر موحدانہ منزل میں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے اولین قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم آئینی طور پر امت میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کرنے کی تجاویز عمل میں لائیں اور اپنا نصاب تعلیم اس انداز کا مرتب کریں کہ ہماری آنے والی نسلیں خود بخود تفرقہ کی حالت کو چھوڑ کر امت کی وحدت میں گم ہو جائیں۔ اس وقت نہ شخصی اور ملکی قوانین کی تفریق باقی رہے گی۔ نہ عبادات و معاملات میں فرق کیا جائے گا۔ ایک خدا کی کتاب۔ ایک امت۔ اور ایک نظامِ زندگی۔ اسے کہیں گے اسلامی معاشرہ۔ (صفحہ ۳۸-۳۷)

یہ ہے جو کچھ طلوع اسلام نے لکھا تھا اور وہ ہے جسے ندوی صاحب طلوع اسلام کی طرف منسوب فرمائے ہیں! افترا پردازی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے!!

لا اکراہ فی الدین اب ذرا ان کی "لا اکراہ فی الدین" والی دلیل کو سامنے لائیے۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کے اس حکم کی رُو سے کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس آیت سے جو نتیجہ ندوی صاحب مرتب کرنا چاہتے ہیں ذرا اس پر غور کیجئے۔ (مثلاً) ایک شخص برضا و رغبت مسلمان ہوتا ہے۔ لیکن شراب پیتا ہے۔ جب اسلامی حکومت اسے اس سے روکتی ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین قرآن کا حکم ہے تم مجھے شراب پینے سے روک نہیں سکتے! تم جس چیز کو میری کفر کی حالت میں گوارا کرتے تھے اسلام لانے کے بعد میری اس آزادی کو کس طرح

چھین سکتے ہیں؟ فرمائیے آپ اسے اس جواب کے لئے کہاں تک حق بجانب سمجھیں گے؟

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں فرقہ بندی جائز ہے یا نہیں؟ اگر یہ جائز نہیں تو اسلامی حکومت کا فریضہ ہوگا کہ نہی عن المنکر کے ارشادِ خداوندی کے ماتحت اسے روک دے۔ اسلام، کفر کو برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن جو شخص مسلمان ہو جائے اسے کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ اُسے اسلامی آئین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اسلام چھوڑ کر پھر دائرۂ کفر میں چلا جائے۔

پہلا پتھر

اب ندوی صاحب کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

> دوسرا عملی سوال یہ ہے کہ مسیح کے الفاظ میں پہلا پتھر کون اٹھائے گا۔ ہماری موجودہ حکومت تو یہ حرکت کرنے سے رہی کیونکہ اس کی اسلامیت، اس کی ذہنی و فکری استواری اور توازن میں بحمداللہ ابھی تک کوئی خلل پیدا نہیں ہوا۔ ہاں اگر پاکستان کی بدقسمتی سے ایسے لوگ برسرِ اقتدار آجائیں جن کی فکری سطح بالکل وہی ہو جو پرویز صاحب اور ان کے جنونیوں کی ہے تو اس حرکت اور اعلان کے بعد کہ آج سے تمام فرقوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا ہے ایسی حکومت کتنے لمحے زندہ رہ سکتی ہے اور اقتدار کس برتے پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔ کیا پرویز صاحب مذاہب و فرق کو ختم کر دینے کی عملی پالیسی کی مزید تشریح فرمائیں گے؟
>
> اتنی موٹی سی حقیقت تو سبھی جانتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اس لئے اگر عوام ہی کے عقائد و ایمانیات کے خلاف جن کے بل بوتے پر اس کی سطوت کا ایوان رفیع قائم ہے کوئی حکومت قدم اٹھائے گی تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ اسی وقت یہ اقتدار پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اس صورت میں پرویز صاحب اور ان کے مریدان باصفا کیونکر ایسی حکومت کو بچا سکیں گے۔

ندوی صاحب کے اس اعتراض سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت سے لے کر اس وقت تک ہم اور مسلسل تقاضا ہو رہا ہے کہ یہاں اسلامی نظام، اسلامی حکومت اور اسلامی شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہاں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دیکھے کہ عوام کے بعض عقائد و رسوم، اسلام کے یکسر خلاف ہیں تو کیا اس حکومت کا یہ فریضہ نہیں ہوگا کہ وہ ان غلط عقائد کی اصلاح اور باطل رسومات کی روک تھام کرے؟ اگر اس حکومت کو ہر وقت یہی خدشہ دامنگیر رہا کہ اگر ہم نے عوام کے غلط عقائد کی اصلاح کے لئے کوئی قدم اٹھایا تو عوام اس سے ناراض ہو جائیں گے۔ اور "ہمارا اقتدار پارہ پارہ ہو جائے گا"۔ اس لئے لوگ جن غلط راستوں پر جا رہے ہیں، انہیں انہی راستوں پر جانے دینا چاہیئے۔ تو پھر اسلامی حکومت کے قیام سے فائدہ کیا ہوگا؟

آپ نے غور فرمایا کہ ندوی صاحب نے اس خیال کو پھیلا کر، غلط رو عوام کو غلط روش پر بدستور چلے جانے کے لئے کتنا

بڑا لائسنس عطا کر دیا ہے اور کس طرح حکومت کو دھمکی دیدی ہے کہ اگر تم نے عوام کی غلط روی کی اصلاح یا روک تھام کی تو تمہارے اقتدار کی خیر نہیں۔ اس سے آپ نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہماری مذہبی پیشوائیت عوام کو اپنے ساتھ رکھنے (اور یوں اپنا اقتدار بڑھانے) میں کس حد تک چلی جاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان لوگوں نے عوام سے یہ کہہ کر کہ تمہارے عقائد و رسوم کے محافظ ہم ہیں، ہمیشہ حکومت کے خلاف اپنی متوازی حکومت قائم رکھی ہے اور اب پاکستان میں بھی ان کا یہی پروگرام ہے۔

تیسری دلیل

اس کے بعد ندوی صاحب ایک اور "دلیل" پیش فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

> تیسرا سوال منطقی استحقاق کا ہے۔ پرویز صاحب اور ان کے مریدان باصفا اس حقیقت کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ پاکستان کی لڑائی سب نے اخلاص و اشتراک سے جیتی ہے۔ ان میں سنیوں کا حصہ بھی اتنا ہی ہے جتنا شیعہ حضرات کا۔ اہل حدیث کے اکابر نے بھی اس معرکہ آرائی میں داد شجاعت دی ہے اور حضرات احناف کے عمائد نے بھی پنجہ آزمائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان حالات میں کسی ایک جماعت کو یا ان سب کو چند عطائیوں کے سوا گردن زدنی قرار دے دینا آخر کس منطقی استحقاق کی بنا پر جائز سمجھا جائے گا۔ ان خرافات لایعنی کے بجائے جن کو پریشان خیالی اور ذہنی افتراق کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پرویز صاحب اگر یہ کہتے کہ تمام فرقوں کو بنیادی اور اساسی افکار اسلامی پر جمع ہو جانا چاہیئے، اور اپنے معمولی اور جزوی اختلافات کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہیئے کہ اس سے نفس اسلام سے وابستگی کا جذبہ کمزور ہو جائے تو یہ بات معقول بھی ہوتی اور قابل عمل بھی۔ اس سلسلہ میں حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ وحدت فکر کی اس عملی شکل کو پروان چڑھانے کے لئے نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو کام میں لایا جائے۔

آپ نے اس دلیل کے وزن کا تو اندازہ کر لیا ہوگا۔ لیکن ندوی صاحب نے "پاکستان جیتنے والوں" کی جو فہرست پیش کی ہے۔ وہ نامکمل ہے۔ اس لڑائی میں، شرابی۔ زانی۔ جوئے باز۔ بدقماش۔ چور۔ اچکے۔ ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ اب اگر حکومت نے شراب۔ زنا۔ جوا وغیرہ کی روک تھام کے لئے کوئی اقدام کیا تو یہ لوگ کہہ سکتے ہیں، (اور ندوی صاحب کے استدلال کے مطابق وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہوں گے) کہ صاحب! ہم نے پاکستان حاصل کرنے میں برابر کا حصہ لیا تھا۔ آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کریں؟ یہ عجیب شرافت ہے کہ پاکستان کے حصول کے لئے تو ہم سب سے مدد لی اور جب پاکستان حاصل ہو گیا تو ہمارے ہی خلاف اقدامات شروع کر دیئے!

ان حضرات کو کون سمجھائے کہ شیعہ۔ سنی۔ اہل حدیث۔ احناف۔ یا خوش اطوار اور بدکردار لوگوں نے سب نے مل کر پاکستان کے حصول کی کوشش اس لئے کی تھی کہ ایک خطۂ زمین مل جائے جس میں ہم اسلامی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں اس لئے اس خطۂ زمین میں ان تمام چیزوں کی روک تھام کرنا جن کی اسلام میں اجازت نہ ہو اس مقصد کے عین مطابق ہوگا

جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

لہٰذا سوال پھر وہی سامنے آتا ہے کہ اسلام میں فرقوں کی اجازت ہے یا نہیں۔ اگر اسلام میں فرقہ بندی ممنوع ہے تو پھر ندوی صاحب کے یہ دلائل پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتے۔ انہیں چاہیئے یہ تھا کہ پہلے اصل سوال پر بحث کرتے اور ثابت کرتے کہ اسلام میں فرقہ بندی کی ممانعت نہیں۔ اگر وہ ایسا ثابت کر دیتے تو پھر ان سوالات کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی لیکن (آپ دیکھیں گے کہ) وہ اپنے قارئین کو ان غیر متعلقہ باتوں میں الجھا کر اس لئے رہے ہیں کہ فرقہ بندی کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ (۲۳/۱۱۷)

صحیح دعوت

اس کے بعد ندوی صاحب لکھتے ہیں۔

> ان خرافات لایعنی کے بجائے جن کو پریشان خیالی اور ذہنی افراتفری کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، پرویز صاحب اگر یہ کہتے کہ تمام فرقوں کو بنیادی اور اساسی اقدار اسلامی پر جمع ہونا چاہیئے، اور اپنے معمولی اور جزوی اختلافات کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہیئے کہ اس سے نفسِ اسلام سے وابستگی کا جذبہ کمزور ہو جائے تو یہ بات معقول بھی ہوتی اور قابلِ عمل بھی۔ اس سلسلہ میں حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ وحدتِ فکر کی اس عملی شکل کو پروان چڑھانے کے لئے نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو کام میں لایا جائے۔

طلوعِ اسلام نے یہی کہا تھا (اور اسی پمفلٹ میں کہا تھا جس پر ندوی صاحب تنقید فرما رہے ہیں) اس نے مختلف فرقوں کو سامنے لانے کے بعد کہا تھا کہ

> ان حالات میں پاکستان میں اسلامی آئین و قوانین کی ترتیب کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم (جس کے متن کے متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہونے میں کسی کو کلام نہیں) مملکت کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس کے احکام و قوانین کی تعبیر میں خارج از قرآن کسی چیز کو قرآن پر حاکم اور قاضی نہ تصور کیا جائے۔ بیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہماری تمام مشکلات کس طرح حل نہیں ہوتیں؟ (ص ۳۹)

آپ فرمائیے کہ "تمام فرقوں کو بنیادی اور اساسی اقدارِ اسلامی پر جمع کرنے" کا اس سے بہتر طریق اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی بنیاد قرآن پر رکھ دی جائے؟

اصل سوال

اس تمہید کے بعد ندوی صاحب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اسے ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اصل سوال یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> اس وضاحت کے بعد آیئے ہم اپنے اصلی موضوع کی طرف لوٹیں اور مذہبی و دینی فرقوں کا پس منظر بیان کریں۔

نہیں ذرا ٹھہریے۔ پہلے مذاہب و ادیان کے بارے میں ایک جبلیاتی اصول ذہن نشین کر لیجئے۔ ہر ہر مذہب جب ابتدا میں منصۂ شہود پر آتا ہے تو اپنے ان اصولوں کے علاوہ جن کی وہ تبلیغ و اشاعت کرتا ہے کچھ ایسے پنہاں اور مضمر رجحانات بھی اپنے اندر رکھتا ہے جن کی تشریح و توضیح تاریخ و وقت کے تحت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ وید دنیا کی قدیم ترین یادگار ہیں۔ ایک عرصہ تک ان کا غلغلہ رہا۔ اور تہذیب و ثقافت کے ڈھانچے ان کی بنا پر قائم ہوتے اور بنتے رہے۔ اس کے بعد ان کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یعنی ذہن انسانی صرف سادہ اور مجمل تعلیم پر قانع نہ رہ سکا۔ اس فطری تقاضہ اور طلب نے اُپنشدوں کو جنم دیا جس کے نتیجے میں قدیم ہندوؤں میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔ پھر ان میں جو قانونی مضمرات اور تشریع سے متعلق رجحانات تھے ان کی تسکین قانون کی کتابوں سے ہوئی جنہیں سمرتی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نے بھی متعدد مدارس فکر کی تخلیق کی جو آج تک ہندو سماج کا جزو لاینفک ہیں۔

یہودیوں کو اولاً "اسفار خمسہ" سے نوازا گیا۔ ان میں جو حصہ قانون کا تھا اس کی تکمیل تالمود ایسی اہم قانونی کتاب سے ہوئی۔ اس کے علاوہ جس حصے کا تعلق اونچے روحانی فلسفہ سے تھا۔ یہودی ذہن و فکر اس کی تشریح توضیح میں بھی قاصر اور بے بس نہیں۔ اس طرح کی اجتہادی مساعی نے جن کا تعلق عارفانہ ذوق سے تھا۔ اس لٹریچر کی طرح ڈالی جس کو "قبالہ" کے نام سے متصف کیا جاتا ہے۔

عیسائیت کی تاریخ بھی فطرت کے اس تقاضے سے بیگانہ نہیں رہ سکی۔ اس میں بھی قانون و تشریع کے ضابطوں کو کلیسا نے باقاعدہ مرتب کیا۔ اور سینٹ پال نے جن عناصر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کو از سر نو عیسائیت میں داخل کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر مذہب میں تین اصولی اور بنیادی رجحانات بہرحال ابتدا میں مضمر و پنہاں رہتے ہیں جن کی تکمیل و اتمام کی منزلیں تاریخی ارتقاء سے طے ہوتی ہیں۔ ہمیں اجازت دیجئے کہ اسی ہمہ گیر اصول کی روشنی میں اسلامی فرقوں کی رنگارنگی کا جائزہ لیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ندوی صاحب اس باب میں کہنا کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہتے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے کتاب ہدایت مل جانے کے بعد فرقوں کا وجود میں آجانا خود اس کتاب کی تعلیم کا منطقی اور تاریخی نتیجہ ہے۔ ویدوں کے بعد اُپنشدوں اور سمرتی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح ہندوؤں میں فرقے پیدا ہو گئے۔ تورات (اسفار خمسہ) کے بعد تالمود اور قبالہ کی ضرورت پڑی اور یہودیوں میں فرقے پیدا ہو گئے۔ انجیل کے بعد عیسائیوں میں فرقے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح قرآن کے بعد مسلمانوں میں فرقے پیدا ہوئے۔ یہ فرقے اس انداز تعلیم کی رُو سے پیدا ہونے لازمی تھے جو آسمانی کتابوں میں اختیار کیا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر ان فرقوں کا پیدا ہونا خود مشیت کے پروگرام اور وحی کی تعلیم کے عین مطابق تھا۔

فرقوں کے وجود میں آنے کی یہ توجیہ تو ندوی صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ اور ایک وجہ اُس خط نے بیان کی ہے

جس نے اپنی کتابیں (حضرات انبیاء کرامؑ پر) نازل کی تھیں۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمام انبیاء کو حکم دیا تھا کہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا۔ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ چنانچہ انبیائے کرامؑ نے تفرقے مٹا دیئے لیکن ان کے بعد، ان کی امتوں نے تفرقے پیدا کر دیئے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴)

اور انھوں نے العلم (وحی) آجانے کے بعد تفرقہ نہیں کیا مگر باہمی ضد کی وجہ سے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے کتاب مل جانے کے بعد، لوگ محض باہمی ضد کی بنا پر تفرقہ پیدا کر لیتے تھے لیکن ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ صحیح نہیں۔ یہ فرقے اس لئے پیدا ہوتے تھے کہ خود اس کتاب کے اندازِ تعلیم کا تقاضا ایسا ہوتا تھا۔

آپ فرمائیے کہ اس "متنازعہ فیہ" معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی توجیہ کو صحیح مانا جائے یا ندوی صاحب کی! ندوی صاحب کی توجیہ کو صحیح ماننے میں (ایمان کے چلے جانے کے علاوہ) یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اللہ میاں کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ کتاب ایسی نازل کرتا ہے جس کا فطری نتیجہ فرقوں کا وجود ہے۔ اور دوسری طرف وہ تفرقہ اور اختلاف کو "عذابِ عظیم" کا موجب قرار دیتا ہے! یہ عجیب قسم کا انصاف ہے؟ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۰۴)

(مسلمانو) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے واضح احکام مل جانے کے بعد باہمی تفرقہ کیا اور اختلاف کرنے لگ گئے۔ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اسلام میں فرقے

اس کے بعد ندوی صاحب لکھتے ہیں۔

اسلام نے اور کتاب و سنت کی تعلیمات نے زندگی کا جو سانچہ تجویز کیا وہ بھی اگرچہ اصولی حد تک قطعی مکمل اور واضح تھا۔ تاہم اس میں ایسی بنیادی مضمرات اور اساسی رجحانات کی گرہیں یقیناً موجود تھیں۔ جن کو کھولنا آئندہ دور کے متکلمین، فقہاء اور صوفیاء کا کام تھا۔ اور جن کو مزید تابش و ضو بخشنے کا ذریعہ ان حضرات پر عائد ہوتا تھا۔ جو بعد میں آئیں۔ واخرین منھم لما یلحقوا بھم۔ یوں سمجھئے کہ قرآن و سنت کے ان مضمرات کو ہم تین عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو مزید تشریح کے متقاضی تھے۔

کلامی

فقہی ——— اور

عارفانہ

جب مسلمانوں نے یونانی علوم و فنون پڑھے، ان کے ترجمے کئے اور عقل و فکر کے اُن پیمانوں کو عام کیا جن کے یہ علوم و فنون حامل تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان پیمانوں کی روشنی میں اپنے عقائد و مسلمات کو پرکھنا شروع کیا اور ان کے نتیجے میں اشاعرہ، معتزلہ اور ماتریدی پیدا ہوئے۔ اس مرحلہ پر ہم ان کی تصویب کے حق میں نہیں ہیں، ہمارا موقف صرف یہ ہے کہ عقائد میں یہ بوقلمونی ایک تاریخی و فکری تقاضہ یا حادثہ تھا جس سے مسلمانوں کے اہل فکر طبقہ کو بہر حال دوچار ہونا تھا۔

فقہی رجحان نے مذاہب اربعہ اور اہل السنت کے دوسرے بہت سے غیر معروف فقہی مدارس کی تخلیق کی جو گو آج موجود نہیں ہیں مگر کتابوں میں مذکور ہیں۔ ہمارے نزدیک ارتقار کی یہ صورت قطعی صحت مند اور حق بجانب تھی۔ اہل السنت کے یہ فقہی مدارس خدانخواستہ کسی انحراف، زیغ، کھلی ہوئی گمراہی، اور ضلالت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد نصوص اور نصوص سے استدلال و اجتہاد پر قائم ہے۔ جن لوگوں کی فقہ پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ان مذاہب فقہیہ میں جو فرق ہے وہ گمراہی یا شرک و ضلالت کا فرق ہرگز نہیں بلکہ ترجیح مراتب کا ہے۔ حضرات احناف ایک دلیل کو راجح سمجھتے ہیں تو شوافع یا اہل حدیث کے نزدیک وہ مرجوح ہے۔ اسی طرح شوافع ایک دلیل کو ترجیح دیتے ہیں تو حنابلہ یا موالک اس کو راجح نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کا اختلاف ارتقار کے منافی نہیں۔ ان میں مضرت یا شرک کے شوائب صرف اس وقت ابھرتے ہیں جب ان مذاہب کے ماننے والے حدود اعتدال سے متجاوز ہو جائیں۔ جب ان کی اسلامی عصبیت کمزور ہو جائے، جب خدا اور رسول کی براہ راست اطاعت کا جذبہ گروہی اور تقلیدی عصبیتوں سے بدل جائے۔ یا زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہئے کہ جب کتاب و سنت کی حیثیت اولیں مستندات کی نہ رہے اور ہر شخص اپنے حلقہ اور دائرہ کے تعصبات کو زیادہ درخور اعتنا سمجھنے لگے۔

ایک بات پوری وضاحت سے سمجھ لینے کی یہ ہے کہ یہ نقص و مضرت ان مدارس فکر اور فقہی مذاہب کی رنگارنگی کا لازمی نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سراسر نفسیاتی کیفیت ہے جو اہل حق کی بے توجہی اور عدم تربیت کی وجہ سے ابھر آئی ہے۔

مذاہب و فرق میں جس طرح کلامی و فقہی تقاضہ تاریخی اور بنیادی ہے۔ اسی طرح عارفانہ رجحان اور تصوف کا مذاق بھی اصلی، فطری اور بنیادی ہے جس سے کسی طرح بھی قطع نظر ممکن نہیں۔ اس ذوق اور طلب نے بھی مختلف لطائف مختلف معانی اور ابدی گہرائیوں کی تخلیق کی ہے جو ہمارے ادبیات کا ایسا مایۂ ناز سرمایہ ہے کہ جس سے دستبردار ہونا پرلے درجے کی محرومی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ صوفیہ میں کچھ ایسے گروہ اور فرقے بھی پیدا ہوئے جو جادۂ اعتدال سے منحرف ہیں اور جن کے عقائد و افکار میں عجمیت کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ مگر ہمیں اس سے بحث نہیں، ہم صرف انسانیت کے اس مضمر اور باطنی تقاضے سے بحث کر رہے ہیں۔ جس نے عارفانہ ذوق کو سنوارا اور چمکایا، جس نے گلشن القار و احسان

کی آبیاری کی اور جس نے بے شمار ایسے اونچے کردار کے حضرات کو پیدا کیا جن کی بدولت آج ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کی گہماگہمی ہے اور رونق ہے۔

ان حقائق سے یہ بات نکھر کر نظر و بصر کے سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں مختلف فرقوں کو تاریخ اور فطری تقاضوں نے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اگر ان کو مٹانا اور ختم کرنا ہے تو اس کے لئے تاریخ کی ستم ظریفیوں کا انتظار کیجئے۔ یہ کام حکومت یا کچھ لوگوں کے کرنے کا نہیں، فطرت اور زمانے کا ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کا جو نظام عطا فرمایا تھا وہ اصولی طور پر قطعی مکمل اور واضح تھا۔ ان اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا حل دریافت کرنا امت کا فریضہ تھا۔ اسی کو ندوی صاحب بنیادی مضمرات اور اساسی محتویات کی گرہیں کھولنا کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ گرہیں فرقے پیدا کئے بغیر نہیں کھل سکتی تھیں؟ قرآن کا جواب ہم اوپر دیکھ چکے ہیں جس کی رو سے یہ تصور غلط ہے کہ وحی کی تعلیم کے اصولی ہونے کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ فرقے وجود میں آئیں۔ قرآن کے بعد اس سوال کا جواب تاریخ سے پوچھئے۔ اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کے اصولی قوانین کی گرہیں سب سے پہلے عہد رسالتمآب اور زمانہ خلفائے راشدین میں کھلی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس دور میں اس گرہ کشائی سے کوئی فرقہ وجود میں آیا تھا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ نہ رسول اللہ کے زمانہ میں کوئی مذہبی فرقہ وجود میں آیا تھا نہ خلافت راشدہ کے دور میں۔ ممکن ہے کوئی کہہ دے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں شیعہ حضرات کا فرقہ وجود میں آگیا تھا۔ سو اول تو اس وقت وہ فرقہ مذہبی فرقہ نہیں تھا۔ ایک سیاسی جماعت تھی۔ لیکن اگر کسی کو ان کے مذہبی فرقہ ہونے پر اصرار ہو تو ہم اس پر بحث نہیں کرتے۔ اس سے پہلے صحابہ کبارؓ کا کچھ زمانہ تو بہرحال ایسا گذرا تھا جس میں کسی فرقہ کا وجود نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر دین کے مضمرات کی گرہ کشائی کا لازمی نتیجہ فرقوں کا وجود میں آجانا ہے تو اس زمانہ میں کوئی وجود میں کیوں نہ آیا؟ کیا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں دین کے مضمرات کی کوئی گرہ نہیں کھولی گئی؟ اگر کھولی گئی تو وہ کونسا فرقہ تھا جو اس طرح وجود میں آگیا تھا؟

آپ نے دیکھا کہ قرآن اور تاریخ دونوں کس طرح ندوی صاحب کی توجیہہ کی تردید کر رہے ہیں؟

قرآن نے دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں۔ اسلامی مملکت ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے عملی مسائل کا حل افراد امت کے مشورہ سے دریافت کرے گی۔ اور اپنے فیصلوں کو قانونی حیثیت سے ملک میں نافذ کرے گی جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوگا۔ اس طریق کار کے مطابق امت میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ جب تک یہ نظام قائم رہا فرقے پیدا نہیں ہوئے۔ فرقے اس وقت وجود میں آئے جب خلافت ملوکیت سے بدل گئی۔ امور مملکت کے متعلق فیصلے سلطنت کی طرف سے صادر ہونے لگے اور عبادات اور شخصی معاملات کے متعلق ارباب فقہ نے اپنے اپنے طور پر فیصلے شروع کر دیئے۔ اس لئے فرقوں کا وجود غیر قرآنی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے طرز تعلیم کا پیدا کردہ نہیں۔ فقہی اختلافات، فرقوں کا باعث بنتا ہے۔ چونکہ قرآنی نظام میں فقہی مسائل کا فیصلہ مملکت کی طرف سے ہوتا ہے اور انفرادی

فیصلے صادر کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہوتا۔ اس لئے اس میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

باقی رہا قرآنی حقائق (مثلاً صفاتِ خداوندی۔ تخلیقِ کائنات۔ ملائکہ۔ حیات بعد الممات وغیرہ) کے متعلق اربابِ علم کا فکری اختلاف، سو انفرادی طور پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ قرآن کی کسی بنیادی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ اس سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی اس کی کوشش بھی کرے تو ایسا فرقہ آگے چل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرقے جو محض مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق اختلافِ فکر و نظر کی بنا پر وجود میں آئے وہ باقی نہیں رہے۔ باقی وہی فرقے رہے جن میں فقہی اختلاف تھا۔ نیز اسلامی نظام میں جہاں قرآن کریم کی صحیح تعلیم عام ہوگی اس لئے اس میں ایسے نظری مسائل کبھی بار نہیں پا سکیں گے جو روحِ اسلام کے منافی ہوں۔ نہ ہی اس قسم کے فکری اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر ہوگی۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے (اقبال کے الفاظ میں) یہ اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔ قرآنی نظام میں اس قسم کی رہبانی اور انفرادی طرزِ زندگی کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالتمآب اور صحابہ کبار کے اسلامی معاشرہ اس لفظ تک سے نا آشنا تھا۔ اور جسے ندوی صاحب "اصلی۔ فطری اور بنیادی" رجحان قرار دیتے ہیں قرنِ اول میں اس کا کہیں سراغ تک نہیں ملتا۔ ندوی صاحب نے کہا ہے کہ تصوف کی تحقیق اور اس کا ماحصل "ہمارے ادبیات کا ایسا مایۂ ناز سرمایہ ہے کہ جیتے جی جس سے دستبردار ہونا پرلے درجے کی محرومی ہے"۔ لیکن یہاں گفتگو دین کے بارے میں ہو رہی ہے۔ "ادبیات" کے بارے میں نہیں ہو رہی۔ سوال یہ ہے کہ اس مایۂ ناز سرمایہ کی دینی حیثیت کیا ہے جس کے نام تک سے دین نا مانوس ہے! تصوف ایک فن ہے۔ دین نہیں۔ اس لئے دین کے سلسلہ میں اس پر بحث ہی نہیں ہونی چاہیئے۔

بہرحال جہاں تک قرآنی حقائق کا تعلق ہے، جوں جوں انسانی علم بڑھتا جائے گا ان کے مضمرات نمایاں طور پر سامنے آتے جائیں گے لیکن اس سے فرقہ کوئی نہیں بنے گا۔ فرقہ زندگی کی عملی راہ میں اختلاف سے وجود میں آتا ہے اور امت میں مرکزیت عملی راستے میں اختلاف پیدا نہیں ہونے دیتی۔

باہمی تکفیر

ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ "مذاہبِ فقہیہ میں جو فرق ہے وہ گمراہی یا شرک و ضلالت کا فرق نہیں بلکہ ترجیح مراتب ہے۔۔۔۔ ان میں مضرت یا شرک کے شوائب صرف اس وقت ابھرتے ہیں جب ان مذاہب کے ماننے والے حدودِ اعتدال سے متجاوز ہو جائیں"۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان مختلف فرقوں میں فرق صرف ترجیح مراتب کا ہے گمراہی اور غلط روی کا نہیں تو ان فرقوں کے اکابر صدیوں سے ایک دوسرے کی تکفیر کیوں کرتے چلے آ رہے ہیں (اور آج بھی یہ "جہادِ عظیم" بدستور جاری ہے)۔ دور نہ جائیے ۵ راگست کا الاعتصام دیکھئے جس کے اداریہ میں حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں۔

> مولانا غلام غوث صاحب کی عصبیت ملاحظہ فرمایئے کہ ضلالت کے جو نمونے انھوں نے پیش فرمائے ہیں ان میں بریلوی حضرات کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ بریلوی حضرات سے متعلق سب جانتے ہیں کہ علمائے دیوبند ان کے

اکابر کے لئے کفر ہے کہ کسی فتوے پر ان کا قلب مطمئن نہیں ہوتا ...... اہلِ حدیث کے خلاف تو زہر چکانی کی جائے
لیکن بریلوی حضرات کی مشرکانہ رسوم اور بدعات کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔

ندوی صاحب کا ارشاد تھا کہ ان فرقوں میں ضلالت اور شرک کا فرق نہیں۔ لیکن نور الاعتصام جس نے ندوی صاحب کا مقالہ اس طمطراق سے شائع کیا ہے، بریلوی حضرات کی رسوم کو مشرکانہ اور بدعت قرار دیتا ہے اور بریلوی حضرات کے فتاویٰ تکفیر کا ذکر کرتا ہے۔ ان فرقوں کی حالت یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنی مسجد میں کسی دوسرے فرقے سے متعلق افراد کو نماز پڑھنے کے لئے آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ (ان مساجد کے متعلق عام طور پر آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں جن میں پولیس تک کو مداخلت کرنی پڑتی ہے اور معاملہ عدالت تک پہنچ جاتا ہے) لیکن ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا فرق گمراہی کا فرق نہیں! ہم ندوی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کتنے اہلِ حدیث ہوں گے جو بریلوی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے؟

نیز اگر ان فرقوں کا باہمی اختلاف کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تو آپ حضرات نے ۱۹۵۶ء کے آئینِ پاکستان میں، سخت تاکید و اصرار کے بعد، یہ شق کیوں داخل کرائی تھی کہ پرسنل لا کے متعلق کتاب و سنت کی تعبیر ہر فرقہ کی الگ الگ ہوگی۔ اور اسی کو مستند سمجھا جائے گا۔ اس سے بڑا اختلاف اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ فرقے نکاح و طلاق جیسے مسائل پر بھی متفق نہیں۔

تہتر فرقے علاوہ بریں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپ نے ان حضرات کی زبانی اکثر سنا ہوگا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک ناجی ہوگا۔ حدیث کے الفاظ اور ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلَاثٍ وَسَبْعِیْنَ مِلَّةً کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً۔ قَالُوْا مَنْ هِیَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ۔ (بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب اعتصام بکتاب و سنت)

(رسول اللہؐ نے فرمایا) بنی اسرائیل کی قوم بہتر فرقوں میں منقسم ہو گئی تھی میری قوم تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی جن میں صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! جنتی فرقہ کونسا ہوگا۔ آپ نے فرمایا وہ فرقہ جس میں میں ہوں اور میرے اصحاب۔

ہم ندوی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر فرقوں کا اختلاف محض فرعی ہے۔ ضلالت کا اختلاف نہیں تو پھر یہ فرقے دوزخ میں کیوں جائیں گے؟

قرآنی دلائل ندوی صاحب نے اس وقت تک کوئی قرآنی دلیل پیش نہیں کی۔ اب وہ اس طرف آتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں، بحث و تحقیق کے اس مرحلہ پر صرف آخری سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے جو یہ آیت پیش کی ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً۔

ہم اس کے جواب میں مندرجہ ذیل گذارشات پیش کریں گے:۔

۱۔ حسب عادت اس آیت میں بھی پرویز صاحب نے تحریف کی ہے۔ اصل آیت یوں ہے۔

واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم۔ (الآیۃ)

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہیں نماز قائم کرنا چاہیئے اور مشرکوں میں نہ ہونا چاہیئے۔ گویا نماز نہ پڑھنا ایک گونہ شرک ہے۔ الذین فرقوا دینھم یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہونا مشرکین کا مزید وصف ہے۔ اس کا تعلق شرک سے نہیں۔ ان مشرکوں سے ہے جو اس اصول دین کو تسلیم نہیں کرتے جس میں نماز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ گویا نحوی اصطلاح میں ... بیان ہے۔

۲۔ بدرجہ تنزل اگر اس کا تعلق تفریق ہی سے ہے، تو جس تفریق سے روکا ہے وہ توحید، آخرت اور نبوت ایسے بنیادی مسائل سے متعلق ہے جن کو فطرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تشریحی اور توضیحی مسائل سے نہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ آیت صاف صاف اس مفہوم پر دلالت کناں ہے۔

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم (تم ایک طرف کے ہو کر دین کے رستے پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ۔ اور خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اختیار کئے رہو۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا)

ظاہر ہے یہ فطرت، یہ اٹل اور غیر متبدل اصول، جزئیات دین اور تاریخی تشریحات و توضیحات سے قطعی مختلف شے ہیں۔ انہیں کو ملحوظ نہ رکھنا شرک ہے۔

ندوی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس آیت میں صرف اتنا کہا ہے کہ تم نماز پڑھتے رہنا۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تم مشرک ہو جاؤ گے۔ یعنی اس آیت میں صرف نماز کی تاکید آئی ہے۔ تفرقہ کے خلاف قرآن نے کچھ نہیں کہا۔ یہ غلط ہے۔ قرآن نے کہا ہے۔

(۱) صلوٰۃ قائم کرو۔ (اقیموا الصلوٰۃ)

(۲) اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔ (ولا تکونوا من المشرکین)

(۳) یعنی ان میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور ان میں بہت سے فرقے ہو گئے ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے، اس پر اتراتا ہے (من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون) (۳۰: ۳۱-۳۲)

آپ سوچئے کہ اس میں کونسی بات ہے جو واضح نہیں۔ قرآن نے مشرکین کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور مومنین سے کہا ہے کہ تم نے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے ترجمہ میں اس مفہوم کو اس طرح واضح کر دیا ہے کہ

و برپا دارید نماز را۔ و مباشید از مشرکان۔ مباشید از آنکہ پراگندہ ساختند دین خود را و شدند گروہ گروہ۔ ہر گروہ بآنچہ نزدیک اوست خرسند است۔

اس ترجمہ اور مفہوم کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقام سے بھی ہوتی ہے۔ جہاں کہا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۵)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا۔ بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آ گئے تھے۔ انہی کے لئے سخت عذاب ہے۔

رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور گروہ گروہ ہو گئے، تیرا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

اور یہ آیت تو الاعتصام کی پیشانی پر مستقلاً درج ہوتی ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ...... (۳/۱۰۲)

اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو۔ اور تفرقہ پیدا مت کرو۔

کیا الاعتصام بتائے گا کہ اگر قرآن کریم نے فرقہ بندی سے منع نہیں کیا تو اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

ندوی صاحب نے ان آیات کو چھوا تک نہیں۔ اس لئے کہ یہ وہ عصائے موسوی ہے جو ساحرین کی نظر فریب رسیوں کو نگل جاتا ہے۔

ندوی صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مسلمان نماز کے پابند ہیں تو پھر فرقہ بندی سے کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن ہمیں قرآن کریم میں ایک ایسا واقعہ ملتا ہے جو اس کی تردید کرتا ہے۔ سورۂ توبہ میں مذکور ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ ظاہر ہے کہ مسجد نماز پڑھنے کے لئے ہی تعمیر کی گئی تھی۔ لیکن قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ مسجد ضِرَارًا وَّكُفْرًا بنائی گئی تھی۔ یعنی تکلیف پہنچانے کے لئے اور کفر کے لئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کفر کیا تھا جس کے لئے وہ مسجد بنائی گئی تھی؟ اگلے الفاظ نے اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے

کے لئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب بن جائے، تو اس کی تعمیر کفر ہے چنانچہ حضورؐ سے کہہ دیا گیا کہ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا (۹/۱۰۸) "تم نے کبھی اس میں کھڑے نہ ہونا" غور فرمایا آپ نے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اتنا بڑا جرم کہ اگر کسی مسجد سے بھی تفرقہ پیدا ہوتا ہو تو اس مسجد کی تعمیر وجہ کفر قرار پا جاتی ہے۔ قرآن کا تو یہ فیصلہ ہے۔ اور ہمارے مذہب کے پیشوا یہ اعلان فرماتے ہیں کہ مسلمان اگر نماز پڑھتے رہیں تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ فرقوں میں بٹے رہیں۔

ذالك مبلغهم من العلم

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ دلائل جو محترم ندوی صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں کہ اسلام میں فرقہ بندی کی قطعاً ممانعت نہیں۔ ان "دلائل" کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ جماعت اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام نے اس مقصد کے لئے خاص طور پر ندوی صاحب کو منتخب کیا۔ ندوی صاحب نے باوجود علالت شدید اس اہم دینی فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے تکلیف فرمائی۔ الاعتصام نے ایسے پرشکوہ الفاظ میں اس مضمون کا تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد یہ "دلائل" سامنے آئے ہیں! اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس اپنے "مسلمات" کی تائید میں کس قسم کے دلائل و براہین ہیں اور ان کا مبلغ علم کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ یہ معتقدات ان کے ہاں وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں اور کسی نے کبھی کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں کہ علم اور دین کی روشنی میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے پہلے ان "مسلمات" کو کبھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ ان لوگوں کے باہمی مناظرے اور مباحثے فرعی اختلافات سے متعلق ہوتے تھے۔ ان "مسلمات" کو کبھی کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ اب زمانے کے تقاضوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ان "مسلمات" کو علم اور دین کی رو سے صحیح ثابت کریں۔ اب جو انہیں یوں کھڑے ہو کر سوچنا پڑا تو معلوم ہوا کہ ان کی تو بنیاد ہی کچھ نہیں۔ اس کے بعد خلوص و دیانت کا تقاضا تھا کہ یہ حق کا اعتراف کر لیتے لیکن پیشوائیت کا "تمرد" اور "عزت الاثم" اس طرف آنے نہیں دیتا۔ اس کے بعد ان کے لئے اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ پوچھنے والے کو گالیاں دی جائیں اور اس کے خلاف الزامات عائد کر کے اسے بدنام کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ندوی صاحب کے مضمون کا اگلا حصہ ان کی اسی ذہنی کیفیت اور نفسیاتی حالت کا آئینہ دار ہے۔

> بالفرض اگر طبعی و فطری اختلاف رائے کو شرک ہی قرار دیا جائے جب بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ فرقوں کی تقسیم کس نقطۂ اعتدال سے شروع کی جائے کیا کتاب و سنت اور خدا اور رسول کے احکام سے یا تاریخی ترتیب سے۔
>
> دونوں صورتوں میں آپ کا فرقہ سب سے پہلے اس کی زد میں آتا ہے کیونکہ آپ ہی نے آنحضرتؐ کے مقام و موقف کو رسول و نبی کی حیثیت سے گرا کر سربراہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ احادیث کو حجت مانا جائے یا نہ مانا جائے بلکہ آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اس طرح رسول کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا جائے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی اطاعت و غلامی کا جوا گردن میں رہے بلکہ صرف ایک وقتی و ہنگامی قائد

مانا جائے جس کا بدل ایک فاسق و فاجر معاشرہ ہو سکتا ہے۔

کہیئے۔ پوری اُمت میں سے کسی ایک شخص نے بھی آنحضرتؐ کے بارے میں اس درجہ گستاخانہ رویہ اختیار کیا ہے تاریخی اعتبار سے بھی آپ ان افکار و خیالات کا منطقی نتیجہ ہیں جن کی آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے مولوی چراغ علی اور سرسید مرحوم نے ترجمانی کی۔

سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کے پیش نظر کیا سب سے پہلے آپ اپنے فرقہ کو ختم کرکے معقولیت کا ثبوت دیں گے؟

ندوی صاحب یا الاعتصام سے تو اس ضمن میں کچھ کہنا بیکار ہے۔ اگر اس جماعت میں کوئی "رجل رشید" ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ وہ ندوی صاحب سے پوچھیں کہ طلوع اسلام نے کہاں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہؐ کی اطاعت کا بدل (معاذ اللہ) ایک فاسق و فاجر معاشرہ ہو سکتا ہے۔ طلوع اسلام برسوں سے یہ کہتا چلا آرہا ہے کہ

رسول اللہؐ کی زندگی میں اطاعت رسول یعنی باری کے بعد حضورؐ کی اطاعت آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کی طرف منتقل ہوگئی۔ اگر یہ سلسلہ بدستور قائم رہتا تو اطاعت رسول کی یہ عملی شکل بھی قائم رہتی۔ لیکن یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اب اس کے دوبارہ احیاء کی ایک ہی صورت ہے یعنی خلافت علیٰ منہاج رسالت کا قیام۔ یہی خلافت، رسول اللہؐ کی اطاعت کی جگہ لے سکتی ہے۔ طلوع اسلام نے خلافت راشدہ کے بعد کی ملکوں کو ہمیشہ "مسلمانوں کی مملکت" کہا ہے اسلامی حکومت نہیں کہا۔ اس نے ۱۹۵۶ء کے آئین پاکستان کو بھی اسلامی آئین نہیں کہا تھا۔ جس طلوع اسلام کا یہ مسلک ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اطاعت رسول کا بدل ایک فاسق و فاجر معاشرہ کو قرار دیتا ہے، بددیانتی کی انتہا ہے۔

یہی صورت طلوع اسلام کو ایک فرقہ قرار دینے کی ہے۔ جو طلوع اسلام، فرقہ سازی کو قرآن کی رو سے شرک سمجھتا ہو اس کے متعلق یہ مشہور کرنا کہ وہ خود ایک فرقہ ہے بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، اس قسم کے حربوں پر صرف وہی لوگ اترتے ہیں جن کے پاس، اپنے مسلک کی تائید اور دعوے کے اثبات کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ لیکن ان حربوں سے اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ ان حضرات کے اردگرد بیٹھنے والے "سبحان اللہ" کہہ دیتے ہیں۔ اگر انھیں کبھی یہ سننے کی توفیق نصیب ہو کہ

کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا

تو اس وقت انھیں معلوم ہو سکے کہ ان کی اس قسم کی باتوں پر علم کس طرح روتا اور دین کس طرح ماتم کرتا ہے۔ اور سمجھدار طبقہ ان کا کس طرح مضحکہ اڑاتا ہے؟

بہرحال یہ ہیں وہ دلائل جو فرقہ بندی کی تائید میں ان حضرات کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ندوی صاحب کے مضمون کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

مضمون نامکمل رہے گا کہ اگر شرکیہ کے بارے میں یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ یہ "کُلی مشکک" ہے

اس کے کئی درجے ہیں۔ قرآن حکیم نے جس شرک کو ناقابل عفو اور ظلم عظیم قرار دیا ہے اس کا اطلاق صرف شرک کی کھلی ہوئی اور واضح شکلوں پر ہوتا ہے۔ ان گناہوں پر نہیں جن کا شرک سے براہ راست کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یوں تو توحید و شرک کے عارفانہ مفہوم میں وہ وسعت در پھیلاؤ ہے کہ اس میں وہ ادنیٰ لغزشیں بھی داخل ہیں جن کا محرک نفس یا کوئی ادنیٰ درجے کی چیز ہو۔ یہی مقصود ہے اس آیت شریفہ کا۔

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ

کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہے۔

لے بجنسٖہ ندوی صاحب پر یہ حقیقت واضح ہو سکتی کہ فرقہ پرستی کی بنیاد بھی انسان کی خواہش نفس ہے جسے وہ اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اسی کو قرآن نے بَغْيًا بَيْنَهُمْ سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں عالت یہ ہو جاتی ہے کہ

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵)

اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل نفرت کرتے ہیں۔ اور جب اس کے علاوہ اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

فرقہ بندی میں ہر معاملہ کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے۔ اور الدین میں سند خدائے واحد کی کتاب عظیم قرار پاتی ہے۔ جس میں خود کوئی اختلافی بات نہیں اور جو دنیا بھر کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴) اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان پر ان امور کو ظاہر کر دے جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں (یہ کتاب) ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہو جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اختلافات مٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حق و باطل کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے۔ لیکن جن لوگوں نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہو وہ اس معیار کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس سے ان کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور یہی فرقہ بندی کا راز ہے۔

لاہور سے ہر قسم کی ادبی۔ علمی۔ سیاسی کتابیں منگانے کیلئے
مکتبہ طلوع اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور کو ایک کارڈ لکھ دیجئے!

قائدِ اعظمؒ

—— (۱) ——

کتابِ زندگی کا اجمالی جائزہ

(تقدیر کی اذان تھا محمد علی جناح)

★ —— (محترم صفدر سلیمی صاحب)

(تحریکِ پاکستان کے بلند و بالا مقاصد اور قرآنی پیشِ نہاد نے قائداعظم اور طلوعِ اسلام میں قلبی و نظری جو گہری وابستگی قائم کر رکھی تھی وہ آج کی بہت سی یادرفتہ کا محبوب سرمایہ ہے۔ قرآنی نظام کی وہ منزلِ مقصود جس کے لئے بانیٔ پاکستان نے دس کروڑ مسلمانوں کو ایک پرچم تلے منظم ہونے کی دعوت دی تھی آج بھی بدستور ہماری مقدس آرزوؤں کا مرکز و محور ہے اور حیاتِ ملی کے یہی وہ محبوب تقاضے ہیں جو حیاتِ قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے پس منظر کو پوری وضاحت سے منظرِ اشاعت پر لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ "قائداعظمؒ" کے عنوان سے تعارفی تفصیل کا یہ سلسلہ انہی تقاضوں کا جواب سمجھئے۔ اس سے قبل حیاتِ سرسیدؒ کے بارے میں محترم صفدر سلیمی صاحب کا سلسلۂ مضامین قارئین کے سامنے آچکا ہے۔ یہ سلسلہ تعارف کی اسی سے قلم کی پیشکش ہے۔ (طلوعِ اسلام)

کم و بیش بتیس سال قبل —— ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کا آفتاب ایک عظیم صبحِ انقلاب کا نقیب بن کر چالیس کروڑ انسانوں کے افقِ تقدیر پر طلوع ہو رہا تھا۔ وقت اور حالات کا قافلہ ایک نیا موڑ مڑ رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہی تھی اور مورخ کا قلم ایک نئے باب کا عنوان باندھ رہا تھا۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری جانب دنیا کے دار کی

کے کنارے دو لاکھ انسان اس قومی عزم کو سینوں میں لئے جمع تھے کہ تاریخ کا رخ موڑ دیں۔ اور صدیوں کے قومی زوال اور شکست کی تاریکیوں سے ایک نئی صبح بہار کا عنوان پیدا کریں۔ منٹو پارک کے اس عظیم الشان قومی دربار میں ایک مغنی آتش نفس کی آواز گونج رہی تھی۔۔۔۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناح

اور قومی دربار کا ہر فرد محسوس کر رہا تھا کہ ان کے خالص جذبات و احساسات کی اس سے بہتر ترجمانی ممکن نہیں۔ اور پھر جب اس نے کہا کہ

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

"قائد اعظم زندہ باد" کے گرد دل شگاف نعرے والہانہ شہادت کے ساتھ اپنی اپنی فضاؤں میں گونج اٹھے۔ سب کی نگاہیں مسند صدارت پر مرکوز ہو گئیں۔

آتش نوائی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا۔۔۔۔

غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

تاریخ کی ایک لازوال حقیقت ان الفاظ کی پہنائیوں میں رقص کر رہی تھی۔ راوی کے کنارے جھوم اٹھے۔ شاہی مسجد کے مینار و جدار میں آ گئے اور ان کے سائے میں گہری نیند سونے والے مرد قلندر کی روح پکار اٹھی:

مرغ چمن ابھی ہے یہی تیری نواؤں کا سلسلہ

مسند صدارت پر رونق افروز قائد اعظم کی پلکوں پر انتہائی ضبط کے باوجود تشکر و انبساط کے اشک تیرنے لگے۔

گردش لیل و نہار برق رفتاری سے تاریخ کے کئی کٹھن مرحلے طے کر گئی۔ ملت پاکستان کا کاروان عزم و ہمت دشوار گزار راہوں کو پامال کرتا ہوا عسکری انقلاب کی رزم گاہ جولاں میں داخل ہو گیا۔ بیس سال کی یہ مدت بیتے شب و روز کے جلو میں تیزی سے گزر گئی۔ لیکن تاریخ کے اس نقش تابندہ کی آب و تاب آج بھی بعینہٖ شادابی قلب و نظر کا دو سماں پیدا کر رہی ہے جسے وقت کی رفتار متاثر نہیں کر سکی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہی تاریخی اجلاس تھا جس نے محمد علی جناح کی صدارت میں قرارداد پاکستان کے نام پر اپنی قومی منزل کا تعین کیا اور پھر اسی دور اندیش قائد و سالار کی قیادت میں ہماری ملت نے اس کڑی منزل کو سات سال کی مختصر مدت میں اس فاتحانہ شان سے طے کیا کہ آج مورخ کے لئے پاکستان اور قائد اعظم کے مابین حد فاصل یا خط امتیاز قائم کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی گرانمایہ قیادت تھی جس نے پاکستان کے قومی نصب العین پر

مہر تصدیق ثبت کی اور پھر ملت کے قدم اس حسن تدبر سے نصب العین کی طرف بڑھاتی چلی گئی کہ ایک ایک سنگِ میل نے زبانِ حال سے شہادت دی کہ محمد علی جناح ہماری ملت کا پاسبان بھی تھا اور اس کے سینے میں مچلتی ہوئی روح بھی۔ نہ صرف یہ کہ اُن کا ہر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا بلکہ اس نے اپنے حریفوں کے دلوں میں قدم قدم پر ایک زلزلہ بھی پیدا کئے رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اٹل فیصلے بالآخر تقدیر کی اذاں ثابت ہوئے اور اس نے صفحۂ قرطاس پر جو لکیریں کھینچیں وہ اس برصغیر کی تقسیم کا مستقل عنوان اور چالیس کروڑ انسانوں کی تقدیر کا آخری فیصلہ قرار پا گئیں۔

ہماری تاریخ کا یہ ایک خوشگوار اور خوش آئند انقلاب تھا جس نے نہ صرف غیر ملکی سامراج کے بندھن توڑ کر رکھ دیئے بلکہ برادرانِ وطن کی رام راج کی سازشوں کا تار و پود بکھیر کر ہمیں ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی نعمتِ عظمیٰ سے بھی مالا مال کر دیا۔ کیا یہ اسی دیدہ ور کے حسنِ تدبر اور ملکۂ فراست کا شاہکار نہیں کہ آج ہمیں ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری بننے کا شرف حاصل ہے؟ اسی عظیم اور لازوال تاریخی حقیقت کا روح نواز احساس ہے جس نے آج ہمیں اس سعادت سے بہرہ ور کیا ہے کہ ہم اس بلند و بالا شخصیت کے آستانۂ عظمت پر تحسین و تبریک کی غریبانہ نذر پیش کریں اور اس کے تدبر اور فراست کے ان زندہ جاوید کارناموں کو منظر اشاعت پر لائیں جن کے صدقے میں ایک مایوس اور شکست خوردہ قوم موت کی ہچکیوں سے نجات پا کر عروج و اقبال، آزادی و استقلال اور حکومت و سلطنت کی وارث قرار پائی۔

یورپ کے شہرہ آفاق صحافی بیورلی نکلس نے انتہائی یقین و اعتماد سے اسے "ایشیا کا اہم ترین انسان" قرار دیا تھا اور آج جب ہم اس کی کتابِ زندگی کے اوراق اُلٹ رہے ہیں تو ہمارا دل یقیناً اس حقیقت سے سرشار ہے کہ جہاں وہ ہماری ملت کا محبوب قائدِ اعظم تھا وہاں اغیار کے انصاف پسند حلقوں میں سے "ایشیا کے اہم ترین انسان" کا منصبِ جلیل بھی حاصل تھا۔ حقیقت نگر بیورلی نکلس کی دوربین نگاہیں قیامِ پاکستان سے چار سال قبل (۱۹۴۳ء میں) پردۂ تقدیر سے کیا کچھ ابھرتے دیکھ رہی تھیں۔ یہ جاننے کے لئے اُس کی شہرہ آفاق کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔

> ہندوستان بلاشبہ چند ہی سال میں دنیا کا اہم ترین مسئلہ بن جائے گا۔ اور مسٹر جناح اس باب میں عدیم النظیر نازک اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہیں جنگ کا رُخ موڑ سکتے ہیں۔ دس کروڑ انسان ان کی چشم و ابرو کے اشارے پر حرکت میں آنے کے لئے کمربستہ ہیں۔ یہ مقام کسی اور کو حاصل نہیں۔ ہندو حلقوں میں بھی یہ بات نہیں۔

یہ ہے عظمتِ قائد کے اعتراف کا ایک تابندہ نقش ——— ان ہزاروں زندہ جاوید نقوش میں سے جن کی تابانیوں سے پوری تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر جگمگا رہا ہے۔ اس نے یکساں طور پر اپنوں اور بیگانوں کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا اور سب نے برملا اس کے اوصاف و کمالات کی زبانِ حال سے پکار پکار کر شہادت دی۔

حیاتِ قائد کی ان تاریخی تفاصیل میں حسن ترتیب اور ربط باہمی کا تقاضا ہے کہ سب سے پہلے ہم ان کی

کتابِ زندگی کا ایک مختصر سا جائزہ مجموعی طور پر پیش کر دیا۔ اور اس کے بعد آئندہ اشاعتوں میں ان کی زندگی کی سرگزشت تفصیلاً قارئین کے سامنے آ رہی ہے۔

قلمی خاکہ

قائد اعظم کی پُراثر شخصیت کے ذہن میں اُبھرتے ہی تاریخ چشمِ تصور کے سامنے ایک نحیف و نزار لیکن بہترین انگریزی لباس میں ملبوس "مردِ مشرق" کو لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے سلسلے میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے دورے پر تشریف لاتے ہیں۔ اور اس دور کے چوٹی کے لیڈروں ..... مہاتما گاندھی، دادا بھائی نوروجی وغیرہم ——— سے ملاقات کرتے ہیں اور ساتھ ہی چونتیس سالہ خوبصورت جناح سے بھی۔ (یہ ۱۹۱۸ء کا قصہ ہے) اور پھر وہ اپنی ڈائری میں اس جواں سال اور پختہ کار سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں ———

> ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے گفتگو میں منطقی، داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوا لینے کا متمنی، وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر بھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کی قوتِ استدلال نے پوری طرح، کھل کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے اور اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناح جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

بیورلی نکلس اس سے ملاقات کے بعد اس کی عظمت کا خاکہ کھینچتا ہوا لکھتا ہے۔

> دراز قد، چھریرا بدن، وضعدار، سلک سوٹ زیبِ تن کئے ہوئے اور یک چشمی عینک لگی رہتی۔ ایک سخت سفید کالر گلے میں جسے وہ شدید گرمیوں میں بھی استعمال کرنے کا عادی ہے۔ وہ شرفائے ہسپانیہ کی طرح نظر آتا ہے۔ سیاسی مسلک میں کہنہ مشق مدبر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باعظمت شخصیت مینیٹ جیسی کلب میں رونق افروز کوئی لطیف سا مشروب نوشِ جان کر رہی اور جریدہ "ٹائمز" کے مطالعہ میں مصروف ہو۔
>
> (VERDICT ON INDIA)

طفولیت کی وادیوں سے کارگہ شباب کی طرف

یہ تھا وہ قائد اعظم جس نے ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو [illegible] کراچی کے "وزیر مینشن" میں جنم لیا۔ حسنِ اتفاق کی کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ جب ستر برس بعد قائد اعظم کے حسنِ تدبر کا شاہکار ایک عظیم اسلامی مملکت کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا تو ان کے آبائی مولد کو اس مملکتِ نو کا دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل ہوا جہاں انھوں نے میدانِ حیات میں آنکھ کھولی جب

گئے۔ سندھ مدرسۃ الاسلام میں انھوں نے "بغدادی قاعدہ" اور عربی و فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ اور پھر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرنے کے قابل ہو گئے۔

اس مدت میں اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و فطانت کے کرشمے اعزہ و احباب کے حلقے میں جگمگا اٹھے تھے۔ اپنے خاندان کے ایک مخلص دوست سر فریڈرک کرافٹ کے مشورے پر سولہ سال کی عمر میں یہ منجھا ہوا نوجوان بیرسٹری کی تعلیم کے لئے عازم انگلستان ہو رہا تھا۔ مناسب کہ اس نے لنکن ان سے بڑے امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن دوران تعلیم وہ کسی ایک مقصد پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا۔ طالب علمی میں وہ زیادہ وقت پارلیمنٹ میں برطانوی مدبرین کی تقریریں سننے کے لئے وقف کرتا۔ انھیں لبرل پارٹی کے مکتب فکر سے بالخصوص وابستگی تھی اور اس مکتب کے ممتاز رہنماؤں سے انھوں نے رابطہ بھی قائم کیا۔ آئرش ہوم رول کی تحریک کے سلسلہ میں عظیم سیاستدان مسٹر گلیڈسٹون کی پرجوش تقریریں ان کے ذوق سیاست کا مرکز بنی رہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لبرل پارٹی بڑی تیزی سے برطانوی عوام کی ہمنوائی سے اقتدار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر چہار اطراف آزادی نسواں کے چرچے تھے۔ اور ہندوستان سے ہمدردی کا جذبہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ ہونہار دوراندیش اور سیماب مزاج جناح کا اس ماحول سے متاثر ہونا قدرتی تھا۔ استخلاص وطن کے تقاضا جذبات نے ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر قلب و نظر کو کافی سرشار کر رکھا تھا۔ عین اس مرحلہ پر انگلستان میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کے جذبات و احساسات میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ ہندوستان کے برگزیدہ رہنما دادا بھائی نوروجی ان دنوں اپنے سیاسی مشن کے تحت انگلستان میں قیام پذیر تھے۔ ہر ہندوستانی انھیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جناح تو یوں سمجھئے گویا انھیں اپنا "سیاسی استاد" تصور کرتے تھے۔ برطانوی وزیر اعظم لارڈ سالسبری کو دادا بھائی نوروجی سے ایک سیاسی کد تھی چنانچہ انھوں نے ایک تقریر میں اس محترم ہندوستانی رہنما کو "کالا آدمی" کہہ کر ان کا مضحکہ اڑایا۔ لارڈ سالسبری کے یہ توہین آمیز الفاظ یورپ میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کے لئے وجہ اشتعال ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس اہانت آمیز چیلنج کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے دادا بھائی نوروجی کو ایک حلقہ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لئے امیدوار کھڑا کر دیا اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ ایم۔ اے جناح اور سی آر داس ہندوستانی طلباء کی اس مہم کی قیادت کر رہے تھے۔

بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ گرمجوش لیکن منجھا ہوا نوجوان ۱۸۹۶ء میں اپنے وطن لوٹا۔ اور واپس پہنچ کر دیکھا کہ ان کے والد محترم کا کاروبار تباہ ہو چکا ہے۔ اور پورا خاندان مالی مشکلات سے بری طرح دوچار ہے۔ حالات بے حد دگرگوں تھے۔ چاروں طرف مایوسیوں کا دور دورہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان مایوسیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا اور ابتلا و آزمائش کے اس طوفان سے شکست کھا کر اپنے آپ کو گوشہ گمنامی کے سپرد کر دیتا۔ لیکن جناح کے سینے میں فولاد کا دل تھا۔ وہ وقت اور حالات کے جانکاہ تھپیڑوں سے نبرد آزمائی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے طوفانوں سے کھیلنا اور ستاروں پر کمند ڈالنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا اور سب کے مشوروں کو ٹھکرا کر کراچی سے

مجلہ بمبئی کے ہنگامہ زار میں پہنچ گیا۔

کامرانیاں قدم چومتی ہیں

بمبئی کے ابتدائی تین سال بڑے ہی کٹھن مرحلوں میں سے ہو کر گزرے۔ اتنے بڑے شہر میں بے یار و مددگار نوجوان کے لئے جس کی زندگی آسائشوں سے مالامال تھی نت نئی پریشانیوں، مایوسیوں اور تلخیوں کا سلسلہ تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں تھیں۔ لیکن جناح ان انسانوں سے مختلف تھے جو زندگی کی کڑی آزمائشوں میں احساسِ بے چارگی سے دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا سینہ ایک مردِ خود آگاہ کے عزمِ بلند سے معمور تھا۔ وہ ہمت و جرأت کے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس کے دل میں تو پاش دلولوں کی آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ ان تمام مصائب و مشکلات سے مردانہ وار نبرد آزما رہے اور بالآخر سب کو شکست فاش دے کر ممکنات زندگی کی وہ راہیں ہموار کر لیں جہاں منزلیں قدم لینے کو آگے بڑھتی ہیں اور فتح و کامرانی کا ابر بہار سر پر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

تین سال بعد جب یکایک ابتلاؤں کی تاریکیاں چھٹیں تو بمبئی کے پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی مسندِ اعزاز اس پچیس سالہ نوجوان کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اب انہیں اپنے حالات سنوارنے کا سنہری موقع میسر آتا ہے۔ لیکن ترقی پسند جناح زیادہ دیر تک اس منصب پر قناعت نہیں کرتے۔ اور جب عدلیہ کے انچارج سر چارلس اولیونٹ پندرہ سو روپے ماہوار مشاہرہ پر یہ عارضی منصب انہیں مستقل طور پر پیش کرتے ہیں تو مسٹر جناح شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اس پیشکش کو مسترد کر دیتے ہیں کہ "میں کم سے کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔" سر چارلس اسے مہذب کی بڑ سمجھ کر بمشکل اپنے طنزیہ قہقہے کو ضبط کرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ بڑی حیرت سے سنتے ہیں کہ اس نوجوان کی پریکٹس واقعی پندرہ سو روپے روزانہ سے زیادہ ہے۔

پارلیمانی اور عملی سیاسیات کے کارزار میں

جناح اب بمبئی کے ایک کامیاب بیرسٹر ہیں، چاروں طرف ان کی قانون دانی کی دھوم سی مچی ہے۔ وہ مشکلات و مواقعات کے چکر سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں زندگی کی تمام سہولتیں، در فراغتیں میسر ہیں۔ چنانچہ ان کا قدم ملکی سیاسیات کی خارزار وادیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۵ء میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں شریک ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں سپریم امپیریل کونسل کے انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں وہ بغرضِ تفریح عازمِ انگلستان ہو جاتے ہیں۔ وہیں ہندوستانی طلباء کی سنٹرل ایسوسی ایشن کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں اور وہیں سر وزیر حسن کی پرخلوص دعوت پر پہلی بار آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ رکنیت قبول کرتے ہیں۔ مئی سنہ ۱۹۱۴ء میں وہ ایک بار پھر انڈیا کونسل کی اصلاح کے سلسلے میں کانگریس کے نمائندے بن کر انگلستان جاتے ہیں۔ اور وہاں ہندوستانی طلباء اور ہندوستان دوست انگریزوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں وہ انتہائی جرأت، صاف گوئی اور قوتِ استدلال سے ہندوستان کا نقطۂ نظر انڈیا کونسل کے متعلق برطانوی مدبرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور واضح کرتے ہیں کہ جب تک کونسل میں ہندوستان کو حقیقی نمائندگی حاصل نہ ہو وہ مفید نتائج پیدا کرنے

کی اہل قطعاً نہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کا طائر پیش رس

اس حقیقت کو پیش نظر رکھیے کہ جناح کی سیاسی زندگی کا یہ دور ہندو مسلم اتحاد کی شبانہ روز کوششوں کا ایک مستقل باب ہے۔ کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ میں ان کی شمولیت بھی اسی احساس کی مظہر تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد کی ہندو مسلم کانفرنس ان کی انہی مساعی کا نشان اور اسی شریف ترین جذبہ کی آئینہ دار تھی۔ اس کانفرنس میں ملک کے چوٹی کے زعماء شریک ہوتے ہیں اور جناح اس کانفرنس کے روح رواں ہیں۔ بدقسمتی سے یہ تاریخی کانفرنس ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔ بڑے بڑوں کے دل مایوسیوں میں ڈوب جاتے ہیں لیکن جناح ان ناکامیوں کا ادنیٰ اثر قبول کیے بغیر پورے عزم و ہمت سے اس خارزار میں رواں دواں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اور چھ سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا عزم و استقلال فتحمندی سے ہمکنار ہوتا ہے اور "میثاق لکھنؤ" کے نام سے سنہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما ہندو مسلم اتحاد کے فارمولے پر بالاتفاق مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ ملکی سیاسیات میں جناح کی مساعی جمیلہ کا یہ پہلا شاہکار تھا اور اس کے بعد ہر دو قومیں انہیں "سفیر اتحاد" کے خطاب سے یاد کرتی ہیں۔

ہوم رول لیگ کی تحریک

ہندو مسلم اتحاد کی اس تحریک کو شعوری طور پر آگے بڑھانے اور سیلف گورنمنٹ کی منزل تک پہنچنے کے لیے مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول لیگ کی تنظیم کی۔ اور جب اس نے عوام کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا تو جناح کو بھی دعوت دی گئی کہ اس پلیٹ فارم سے ہوم رول تحریک کی راہنمائی کریں۔ جناح ادنیٰ پس و پیش کے بغیر آگے بڑھے۔ ان کی گرمجوشیوں سے تھوڑی ہی مدت میں اس تحریک کا پلیٹ فارم استخلاص وطن کی جدوجہد کا موثر ترین پلیٹ فارم بن گیا اور اس کی گونج سات ہزار میل دور وہائٹ ہال تک کی فضاؤں میں زلزلہ انداز ہونے لگی۔ اسی دور رس اثر کا اثر تھا کہ لارڈ ہارڈنگ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو مشترکہ دعوت دی کہ وہ ان کے دور حکومت پہ پوری آزادی سے تبصرہ کریں۔ جناح اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھے اور ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کرتے ہوئے پہلے وائسرائے بہادر کی فراخدلی کا اعتراف کیا۔ اور پھر جنگ عظیم میں اہل ہند کی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں کہا—

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستان سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود تمام خون گرنے کے ہندوستانیوں کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کیے جا رہے ہیں۔ آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے...... یہ جنگ آزادی اور استقلال کی بقا کے لیے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا ارباب حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے؟ یاد رکھیے کہ یہ طرز عمل حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔
>
> (قائد اعظم محمد علی جناح)

جناح کے انھیں نعرہ ہائے حریت کا اثر تھا کہ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ---

ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو انتظامی معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں۔ اور رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ کے اس حصہ میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح)

وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اس اعلان کے بعد خود ہندوستان میں تشریف لائے۔ انھوں نے یہاں چوٹی کے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور بالآخر اس کا نتیجہ مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کی اصلاحات کی صورت میں منظر عام پر آیا۔

استعمار پسندوں سے ٹکراؤ

عین اس وقت جبکہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ اپنی مساعئی جمیلہ سے ہندوستان کو مطمئن کرنے کی جدوجہد میں سرگرم کار تھے حکومت ہند میں ایسے استعمار پرست انگریز حکمران بھی موجود تھے۔ جن کے دلوں میں ہندوستانیوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ سلگ رہی تھی۔ انسانی آزادی اور حریت کے یہ ازلی دشمن کسی قیمت پر یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس بدنصیب ملک کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے پائیں۔ لارڈ سڈنہم اور لارڈ ولنگڈن جو یکے بعد دیگرے بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے اپنی مذموم سازشوں کی بنا پر اس طائفہ میں سب سے پیش پیش تھے۔ جناح اس وقت آزادی کے ہیرو اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آنکھ کا تارا شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے کچھ دیر امپیریلزم کے ان بدمستوں کی کارستانیوں کا جائزہ لیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جوان سال اور جوان بخت ہیرو انتہائی جرأت و بے باکی سے ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

لارڈ سڈنہم کے خلاف مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اُن کی آواز پوری قوت سے گونجتی ہے۔

یہی ہے وہ رجعت پسند جو ایک عرصہ دراز تک ہندوستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو چکا ہے، ہندوستان کے خلاف بے شمار قرار دادیں دے چکا ہے اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری گفتگو کا صرف یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام قوت و اختیار رکھنے کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔　　(نوائے وقت، اشاعت خاص، ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء)

اور پھر اس کے بعد وہ لارڈ ولنگڈن سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء کو بمبئی کے ٹاؤن ہال میں یہ معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ حکومت کے چند زر خرید لارڈ ولنگڈن کو بمبئی سے الوداع کرتے ہوئے اہالیان شہر کی طرف سے ایڈریس پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جناح لارڈ ولنگڈن کی مکروہ سازشوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس نے اپنے منصب جلیل کا احترام بالائے طاق رکھ کر کس بے باکی سے مسلم لیگ کے بمبئی کے اہم اجلاس کو سلیمان قاسم مٹھا جیسے غنڈوں کے ذریعے ناکام بنانے کی زیر پردہ سازش کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء سمیت ٹاؤن ہال کے اس سرکار پرست اجتماع

میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور جب پولیس انھیں وہاں سے بزور باہر نکال دیتی ہے تو ٹاؤن ہال کے باہر اہالیانِ بمبئی کا نمائندہ اور تاریخی اجتماع ہوتا ہے اور کروڑوں انسانوں کا یہ زعیم اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے عوام کی قوت اور اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اور اس کے حاشیہ برداروں کے منصوبوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے وہ اپنے فتحمند اور پرجوش حاضرین سے کہتا ہے ــــ

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ اا دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

عوام کی کامیابی اور جمہوریت کی فتح کے ساتھ ساتھ یہ دن قائداعظمؒ کی فائز المرامی کا دن تھا۔ بمبئی کے عوام ان کے اعزاز میں جناح میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ رہے تھے اور بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو وارفتگی کے عالم میں نعرہ لگا رہی تھیں "پیامبر اتحاد زندہ باد"۔

استبداد کا مقابلہ

جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے جانباز سپاہی مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں خون کی ندیاں بہا کر برطانیہ کی سرخروئی اور فتحمندیوں کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ ان قربانیوں کا حق ادا کرنے کے لئے مانٹیگو چیمسفورڈ کے نام پر چند رسمی اصلاحات کے نفاذ کی راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ عین اس وقت جبکہ یہ نمائشی کھیل رچایا جا رہا تھا۔ امپیریلزم کے ایوانوں میں عوام کی جمہوری امنگوں کے خلاف ایک پرفریب اور خطرناک سازش بھی پرورش پا رہی تھی۔ یہ تھا رولٹ ایکٹ جیسے متشددانہ اور ظالمانہ قانون کے نفاذ کا منصوبہ۔ اس تعزیری قانون کے ذریعے عوام کی آزادی تحریر و تقریر اور اظہارِ مافی الضمیر کے خلاف حکومت کو ہولناک ہنگامی اختیارات سے مسلح کیا جا رہا تھا۔

جناح یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کے لئے وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں پورے غیظ و غضب سے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف ایوان کونسل میں ان کی یہ تقریر زورِ خطابت، قوتِ استدلال، غیرتِ قومی اور قہر و جلال کا ایک سیلاب تھی جو برطانوی نمائندوں کے سارے دلائل کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گئی۔ لیکن یہ بل منظور کر لیا گیا اور جناح کی غیرت کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ وہ امپیریل کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں وائسرائے بہادر کے نام قائداعظم کا احتجاجی خط ایک تاریخی یادداشت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور حیاتِ قائد کے اس سلسلۂ تفاصیل کے کسی مناسب مرحلہ پر ہم یقیناً اس خط اور امپیریل کونسل کی تقریر کو قارئین کے سامنے لائیں گے۔

رولٹ ایکٹ برطانوی حکومت کی متشددانہ پالیسی کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ پورے ملک میں اس کے خلاف غم و غصہ کی

ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ جگہ جگہ ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ جواباً پولیس اور فوج نے انتہائی بربریت اور استبداد کا مظاہرہ کیا۔ حادثہ جلیانوالہ باغ اس ظلم و استبداد کا انتہائی انسانیت سوز مظہر تھا۔ امرتسر کے اس باغ میں کوئی بیس ہزار کا اجتماع عام رولٹ ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جمع تھا کہ جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے حکم پر سینکڑوں انسان خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ وحشت و بربریت کا یہ وہ ہیبتناک شاہکار تھا جس کے خلاف پورے ملک میں غیظ و غضب کا طوفان برپا ہوگیا۔ جناح اس صورت حال پر مہر بہ لب کیونکر رہتے۔ جوشِ غضب سے وہ گویا چیخ اُٹھے اور کہا ــــــ

> رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "سنار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کرسکتا ہے اور نہ عورتوں کے آنسوؤں کی روانی انہیں دھو سکتی ہے ...... یقیناً اب ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے جو فرانس اور اٹلی میں اختیار کئے گئے۔
>
> (قائداعظم محمد علی جناح)

اہنسا اور ستیہ گرہ کی بوالعجبیاں

اس مرحلہ پر ہم ملکی سیاسیات کی تاریخ کو ایک نیا رخ اختیار کرتے دیکھتے ہیں۔ گاندھی جی یکایک اہنسا اور ستیہ گرہ کے عجیب و غریب پروگرام لئے مہاتمائی روپ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے نمودار ہوتے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی دلفریب بوالعجبیوں سے سب پر چھا جاتے ہیں۔ جناح کی دوربین نگاہیں ان حربوں کو نہ صرف سیاسی طور پر مضحکہ خیز قرار دیتی ہیں بلکہ انہیں یہ بھی واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس راہ میں مسلمانانِ ہند بالآخر اس سرمایۂ حیات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو صدیوں سے ان کی اسلامی نفسیات کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتا چلا آرہا ہے۔ انہوں نے حتی الامکان سب کو اس پروگرام کے نتائج سے خبردار کرنے کی کوشش کی اور جب اس طرح دار و حاکے سامری کا جادو نہ ٹوٹ سکا تو سنہ ۱۹۲۰ء میں دامن جھاڑ کر کانگریس سے الگ ہوگئے۔ فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (بمبئی) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں اور اہنسا اور ستیہ گرہ کے مضحکہ خیز پروگرام کی مضحکہ خیز حقیقت کو یوں واشگاف کرتے ہیں۔

> حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے مقدس شے فوجی قوت کا حصول ہے۔ جرمنی نے میدان جنگ میں آنے سے پہلے چالیس سال تک فوجی تیاری کی۔ ہندوستان نے آخر فوجی قوت کا کونسا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اور ہمارے پاس اس نوعیت کے کون سے ذرائع ہیں۔ گاندھی جی نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ اور دیہات میں پھیل جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کس لئے؟
>
> (قائداعظم محمد علی جناح)

کانگریس سے مقابلہ

۱۹۲۳ء میں جناح نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے مرکزی امپیریل کونسل کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا اور دنیا نے انتہائی حیرت سے دیکھا کہ کانگرس ان کے مقابلہ میں اپنے جوش و خروش سے اپنا امیدوار لا رہی ہے۔ ہر دلعزیز جناح آزاد امیدوار کی حیثیت سے کسی سہارے کے بغیر تن تنہا انتخابی میدان میں کھڑے ہیں اور دوسری طرف آل انڈیا نیشنل کانگریس اپنی ملک گیر قوت کے ساتھ ان کے مقابلہ پر تُول رہی ہے۔ یہ وہی جناح ہیں جو کل تک کانگریس کے پلیٹ فارم کی زیب و زینت تھے۔ جنہیں "سفیرِ اتحاد" اور "پیامبرِ اتحاد" کہتے ہوئے ان کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں۔ جن کے اعزاز میں جناح میموریل ہال کی تعمیر ہوئی تھی۔ جس کی سیاسی بصیرت، حسنِ تدبّر اور جرأت و بے باکی کانگریس کے لئے بیش بہا سرمایہ ناز و افتخار قرار پا چکا تھا۔ اب وہی کانگریس اس زعیمِ حریت کو شکست دینے کے لئے مسلح ہو رہی تھی۔

لیکن ہر نگہ بصیرت جناح کی عظمتِ کردار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہی ہے۔ بمبئی کے رائے دہندگان اب بھی ان کی قدر و قیمت سے بخوبی معترف ہیں۔ انہیں اب بھی لارڈ ویلنگٹن اور لارڈ ولنگڈن جیسے استعمار و استبداد کے ہیبت ناک مجسموں سے اس بے باک زعیم کے ٹکراؤ کی داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ چنانچہ خود کانگریس کا اپنا آرگن "بمبئی کرانیکل" جرأت سے آگے بڑھتا ہے۔ اور جناح کی حمایت میں رائے دہندگان کے نام ایک پُر زور اپیل شائع کرتا ہے۔ اس اپیل کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں ــــ

> "دو ایک سال سے جماعت اور مسٹر جناح کے درمیان کچھ اختلافات چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کی گذشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ ہی کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جناح کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے اور حقیقتاً وہی ایک ایسی ہستی ہیں جو صحیح معنوں میں اہلِ بمبئی کی کماحقہٗ نمائندگی کر سکتی ہے۔ ..... موجودہ فضا جناح کے مخصوص سیاسی رجحانات اور اندازِ فکر سے بہترین مناسبت رکھتی ہے۔ اور اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناح جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جد و جہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا۔ تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔"

بمبئی کے عوام نے دیوانہ وار اس اپیل پر لبیک کہا۔ وہ اپنے محبوب زعیم سے بے وفائی کے لئے تیار نہ ہو سکے کانگریس کا امیدوار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کانگریس چاروں شانے چت گری۔ اور بمبئی کے عوام کی آنکھ کا تارا بلا مقابلہ کامیابی کا سہرا باندھ کر عوام کی نمائندگی کے لئے امپیریل کونسل میں پہنچ گیا۔ بلاشبہ جناح نے تیسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۵ء) تک ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جاری رکھیں لیکن کانگریس سے ان کا اعتماد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ جناح کی رفاقت اور شادت

کو ٹھکرا کر کانگریس کو جو قیمت ادا کرنی پڑی اور پے در پے جن ہزیمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی مثال تاریخ کے صفحات سے ناپید نظر آئے گی۔

چودہ نکات جناح اور نہرو رپورٹ

رولٹ ایکٹ اور حادثۂ جلیانوالہ باغ کے حادثات، برطانوی سامراج کی بیشانی پر جو رو استبداد کے بدترین داغ ثابت ہوئے۔ ان داغوں کو دھونے کی جو پُرفریب اور نمائشی کوششیں لندن سے شروع کی گئیں۔ ان میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد آئینی اصلاحات کے نفاذ کے لئے ملکی حالات کا جائزہ ظاہر کیا گیا۔ لیکن اس کمیشن میں جسے سر جان سائمن کی قیادت حاصل تھی کسی ہندوستانی نمائندے کو شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ یہ اس ملک کے سیاسی شعور اور قومی نمائندگی کی افسوسناک توہین تھی۔ چنانچہ جونہی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو اس کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ ملک کی تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتوں نے اس کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ جناح نے صورت حال کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں امید کی ایک ہی کرن ان کے ذہن میں ابھری اور اپنی سیاسی بصیرت کا اشارہ پاتے ہی وہ دلائل و براہین سے مسلح ہو کر میدان میں آ گئے۔ انھوں نے لارڈ برکن ہیڈ اور لارڈ ریڈنگ کے اعلانات کو چیلنج کیا۔ انھوں نے کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر شدید نکتہ چینی کی اور واضح کیا کہ اس کمیشن کا تقرر برطانوی حکومت کے ان تمام دعووں کا منہ چڑا رہا ہے جو اب تک ہندوستانیوں کو شریکِ حکومت بنانے کے لئے کئے گئے تھے۔

چنانچہ جونہی ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کمیشن نے ساحلِ بمبئی پر قدم رکھا اس کے مقاطعہ کے سلسلہ دراز کا آغاز ہو گیا۔ وائسرائے ہند کی طرف سے تعاون کئے جانے کی تمام اپیلیں پائے استحقار سے ٹھکرا دی گئیں اور پورے ملک میں جگہ جگہ کمیشن انتہائی مخالفت، کالی جھنڈیوں اور ہڑتالوں کے پُرجوش مظاہروں سے دوچار ہو رہا تھا۔ جناح اس میدان میں پیش پیش تھے۔ ان کی کوششوں سے مرکزی اسمبلی نے بھی اکثریت رائے سے کمیشن کے ساتھ تعاون کی پیشکش مسترد کر دی۔ اور پھر دیگر ممبران اسمبلی کی رفاقت سے انھوں نے ۲۰ فروری کو ایک اپیل شائع کی کہ تمام سیاسی جماعتیں اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کمیشن سے قطع تعلق رکھیں اور ایک آل پارٹی کنونشن کے ذریعے ملک کا آئین متفقہ طور پر مرتب کیا جائے تاکہ سارے ملک کے متفقہ مطالبے کی حیثیت سے حکومت کے سامنے رکھ دیا جائے۔

جناح کی ان مخلصانہ مساعی کی بدولت ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ پھر ۲۸ اگست کو لکھنؤ میں یونی کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس نے ملکی اتحاد کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش کیں ان پر آخری بار مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے ۲۲ دسمبر کو آل پارٹیز نیشنل کنونشن کا تاریخی اجتماع کلکتہ میں ہوا۔ جناح اس کنونشن میں مسلم لیگی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے مشہور چودہ نکات پر مشتمل فارمولا پیش کیا۔ لیکن ہندو بھائی عناصر نے ان نکات کی پُرزور مخالفت کی اور نہرو کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ کے مقابلہ میں ان نکات کو جو صورت حال کا بہترین حل پیش کرتے تھے تسلیم

کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک کا یہ تاریخی کنونشن افراتفری، ذہنی انتشار اور باہمی تلخیوں کی مایوس کن فضا میں ختم ہوا اور اس کی ناکامی نے حکومت خود اختیاری کے امکانات تاریکیوں سے ہمکنار کر دیئے۔ ساتھ ہی مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس دہلی میں جو قائدِ اعظم کی صدارت میں ہوا نہرو رپورٹ کو کلیتہً مسترد کر دیا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا دور

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اب چاروں طرف مایوسیوں کا گرد و غبار چھا چکا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد کی فضا کلیتہً ختم ہو چکی ہے۔ خود مسلمان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی جمعیت پریشاں اور قومی اتحاد زیر و زبر ہو چکا ہے۔ ملک کا ہر رہنما صورتِ حال سے شدید طور پر متاثر ہے۔ تحریکِ استخلاصِ وطن کی نیا منجدھار میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ ملک کے مطلعِ تقدیر پر امید کی ادنیٰ کرن دکھائی نہیں دیتی۔ بگڑی بننے کے امکانات مسدود ہو چکے ہیں۔ مایوسی اور انتشار کی اس دردناک کیفیت میں صرف ایک قائد ہے جو اب بھی خود اعتمادی کی دولت سے مالامال ہے جو اب بھی پورے یقین و اعتماد سے پکار رہا ہے۔

> اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

اور یہ وہی جواں ہمت جناح ہے جس کی ملکی اتحاد کی تمام مساعی پر بہا بھائی ذہنیت نے پانی پھیر دیا جس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو گلے ملانے کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے گئے۔ جس نے دونوں قوموں کو آزادی کی نعمت سے مالامال کرانے کے لیے شب و روز تگ و تاز کی۔ لیکن اس کی پُرخلوص صداؤں کو ہمیشہ بہرے کانوں سے سنا گیا۔ لیکن جناح اب بھی مایوس نہیں۔ وہ اپنی زندگی کی محبوب قومی آرزوؤں اور امنگوں کی چتا کو جلتے دیکھ کر بھی مستقبل کے افق سے امیدوں کی نئی کرنیں تلاش کر رہے ہیں۔

سائمن کمیشن مایوس لوٹ رہا ہے۔ لارڈ ریڈنگ مایوس ہیں۔ وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ کے چہرے پر افسردگی کے آثار ہیں۔ وزیرِ اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ کا سیاسی تدبر اور فراست کوئی منزل سامنے نہیں پاتے۔ مہاتما کی اہمسا اور ستیہ گرہ کی تحریکیں دم توڑ چکی ہیں۔ لیکن جناح! وہ دیکھیے ان کے دل و دماغ اب بھی پوری طرح متحرک ہیں۔ سائمن کمیشن کے انگلستان پہنچنے سے قبل ہی ان کا اہم مکتوب وزیرِ اعظم برطانیہ کی میز پر پڑا ہے۔ وہ حکومتِ برطانیہ کے تدبر اور فراست سے اپیل کر رہے ہیں کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ اور حکومتِ ہند کی آرا موصول ہوتے ہی ہندوستان کے لیے حکومتِ خود اختیاری اور درجۂ مستعمرات کا اعلان کریں۔ اور ان آئینی اصلاحات کے خط و خال اور جزئیات متعین کرنے کے لیے لندن میں ہندوستان کے نمائندوں کی مشاورتی کانفرنس طلب کریں۔ وزیرِ اعظم سر جان سائمن کی واپسی کے منتظر ہیں اور جونہی وہ انگلستان واپس پہنچتے ہیں اور وزیرِ اعظم ان سے جناح کی تجویز کے بارے میں مشورہ طلب کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ہندوستان

سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی یہی ایک راہ باقی تھی۔ یہی وہ واحد اساس ہے جسے ازسرِنو مذاکرات کا حرفِ آغاز بنایا جاسکتا ہے۔

سر سائمن کی تائید کے بعد جناح کی تجویز سلطنتِ برطانیہ کے ممتاز ترین کارفرماؤں کے غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کی بنیاد قرار پا جاتی ہے۔ برطانوی حکومت اور ہندوستانی رہنماؤں کے مابین ایک کانفرنس کے انعقاد کے امکانات پر پوری سنجیدگی سے غور و خوض کیا جاتا ہے۔ اور بالآخر سنہ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ کانگریس اس کانفرنس کا مقاطعہ کرتی ہے لیکن ہندوستان کے مختلف مکاتیبِ فکر کے نمائندے انگلستان پہنچتے ہیں اور لندن کا یہ یادگار اجتماع پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ جناح بہ نفسِ نفیس اس کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ انتہائی خلوص اور قابلیت سے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے بائیکاٹ اور مہاسبھائی عناصر کی متعصب ذہنیت کے منفی حربوں کے باعث یہ کانفرنس مثبت نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

پھر دوسری کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں کانگریس بھی شرکت کرتی ہے۔ جناح اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے شب و روز جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے لیڈروں کو مفاہمت اور رواداری کی کسی معقول سطح پر لانا ان کے امکان میں نہیں ہوتا۔ یہ کانفرنس بھی ناکام ہو جاتی ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں جناح شریک نہیں ہوئے۔ وہ زندگی میں پہلی بار سالہا سال کے اس مسلسل سفر سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں جس کا انھیں نہ کوئی مستقبل نظر آتا ہے اور نہ آگے قدم بڑھانے کے لئے کوئی نشانِ راہ۔ ان کی زندگی کا یہ عظیم ترین ردِعمل نہ صرف مہاسبھائی ذہن کی فساد انگیزیوں کا نتیجہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ مہاتما جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی جفائے وفانما نے ان کے قلب و نگاہ کو متاثر کیا۔ اب ان کی زندگی کا اہم ترین موڑ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا کلکتہ کی آل پارٹیز نیشنل کنونشن اور لندن کی پہلی دو گول میز کانفرنسوں میں جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اس کے بعد ان کا حقیقت پسند ذہن انھیں خوش فہمیوں اور خود فریبیوں میں مبتلا رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف تاریخ کی ایک نئی حقیقت اُبھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔ ہندو لیڈر مختلف قسم کے پُرفریب لبادے اوڑھ کر ہندو قوم کا سنگھٹن مضبوط سے مضبوط تر کئے جا رہے تھے اور ان کی اپنی ملت کا قافلہ صدیوں کے عروج و اقبال سے بے نصیب ہو کر سرِ راہ بھیڑ بکریوں کی طرح منتشر اور پریشان حال کھڑا تھا۔ حرکت و عمل کے اس وسیع سمندر میں جو رنگون سے پشاور تک پھیلا ہوا تھا ان کی اپنی ملت کا سفینہ پرخروش لہروں کے رحم و کرم پر بہے چلا جا رہا تھا۔ اس سفینہ کا نہ کوئی کھیون ہار تھا اور نہ کوئی ساحلِ مُراد۔

اہم موڑ اور نئی منزل

خلوص و ایثار اور عزم و ہمت کے اس پیکر نے جب صورتِ حال کا ازسرِنو جائزہ لیا اور اس کی نگاہوں نے تصویر کے اس رُخ پر بھی نگاہ ڈالی تو اس کی نگاہیں

دیں جم کر رہ گئیں ——

کیا اس قابلِ رحم قوم کے لئے میرے ذمے کوئی فریضہ نہیں ؟

یہ سوال پوری شدت سے ان کے ذہن میں ابھرا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ زبانِ حال سے پکار اُٹھے ——

آہ! میری قوم !!

یہ ذہنی تاثر اس قدر شدید تھا کہ کچھ مدت کے لئے ان کے قلبِ نگاہ گویا منجمد سے ہو کر رہ گئے۔ سارے رہنما لندن کانفرنس سے عازمِ وطن ہو گئے۔ لیکن جناح! ایک گہری فکر کی استغراقی کیفیت چہرے پر لئے اور ہیجان و اضطراب کے سینکڑوں طوفان سینے میں سمائے وہیں لندن کے ایک گوشے میں وقفِ سکون ہو کر رہ گئے۔ ایک تقریر میں اپنی اس کیفیت کو بے نقاب کرتے ہوئے —— بلکہ یوں سمجھئے کہ ماضی کی ناکامیوں کا صاف صاف اعتراف کرتے ہوئے —— انھوں نے کہا تھا۔

> اُس وقت میرے احساسات پر قنوطیت چھا گئی تھی۔ میرے جذبات پر مایوسیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے ملک سے ناامید ہو گیا تھا۔ صورتِ حال انتہائی بدنصیبیوں کی مظہر تھی۔ مسلمان بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ تھا۔ کبھی دولتِ برطانیہ کے کاسہ لیس ان کی قیادت سنبھال لیتے اور کبھی کانگریس کے حاشیہ برداران کی زندگی کے مدعی بن جاتے۔ جب بھی انھیں متحد اور منظم کرنے کی کوئی کوشش ہوئی سرکار کے ٹوڈیوں اور کانگریس کیمپ کے ضمیر فروشوں نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نہ تو ہندوستان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہندو کی ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلا سکتا ہوں۔ یہ احساس بیجا نگی اس قدر بڑھا کہ میں لندن میں ہی اقامت گزیں ہو کر رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہیں رہی تھی بلکہ مجھے اپنی بے بسی کا پورا احساس ہو گیا تھا۔　　(تقاریرِ جناح)

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک وہ چار سال انگلستان میں رہے۔ اس دوران میں وہ ملکی صورتِ حال سے پوری طرح باخبر رہے۔ لیکن عملی سیاسیات سے ایک طرح کا تعلق منقطع رکھا اور اس ساعتِ سعید کے بے تابی سے منتظر رہے جب وہ اپنی ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں۔

صوبہ جاتی خود مختاری کا نیا مرحلہ اور انگلستان سے واپسی

لندن کی ہر سہ کانفرنسوں کے بعد آخر وہ وقت آ گیا جبکہ جناح نے دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی ناخدائی کے لئے ہندوستان کا رُخ کیا اور ہندوستان کے مطلعِ سیاست پر آفتاب بن کر جلوہ بار ہو گئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۵ء نے ملک کے سامنے صوبجاتی خود مختاری PROVINCIAL (ATONOMY) کی نئی منزل پیش کی۔ دس کروڑ بے یار و مددگار مسلمانوں کی نگاہیں رہ رہ کر ان کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ علامہ اقبالؒ اور دیگر عمائدینِ ملت نے انھیں تار ارسال کئے اور ملت کی عزت و حرمت کا واسطہ دے کر انگلستان سے واپس پہنچنے

کی اپیل کی۔ پیکرِ ایثار جناح قوم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے وطن کو روانہ ہو پڑے۔ یہاں پہنچکر انھوں نے مسلم لیگ کو تحریک اور صحت مند سیاسی نظام میں تبدیل کرنے کی جد و جہد شروع کی اور پھر اسلامیانِ ہند سے اپیل کی کہ صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ایک جسدِ واحد کی طرح اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

قومی تنظیم کا عزمِ بلند

مسلم لیگ کی تعمیر اور تنظیمِ جدید بجائے خود ایک کٹھن اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ نئے انڈیا ایکٹ کے تحت ملک کے عام انتخابات قریب آ چکے تھے۔ کانگریس پوری طرح منظم اور کیل کانٹے سے لیس ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں چاروں طرف انتشار کا دور دورہ تھا۔ کچھ برطانوی سامراج کی حاشیہ برداری کو وظیفۂ زندگی بنا چکے تھے۔ کچھ مقدس جبّوں میں لپٹے ہوئے "امام الہند" اور "شیخ الہند" تھے جنھوں نے وردھا آشرم اور آنند بھون سے رشتۂ وفا استوار کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جناح نے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے افرادِ ملت کو دعوتِ تنظیم دی۔ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا۔ لیکن وقفہ اتنا مختصر تھا کہ سنہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں جو نتائج سامنے آئے وہ بڑی حد تک امید افزا نہیں تھے۔ کانگریس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کی اور وہاں اپنی وزارتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسلم لیگ کو بنگال اور سندھ میں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم کرنے کا موقع مل سکا۔ لیکن قافلہ سالارِ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا عزم کر چکا تھا۔ اُس نے اپنی جان توڑ جد و جہد جاری رکھی۔

اسی دوران میں اقبالؒ و جناحؒ میں وہ تاریخی خط و کتابت ہوئی جس میں نہ صرف مستقبل کے قومی سفر کی راہ متعین کی گئی بلکہ اس سفر کے نشانِ راہ بھی۔ انہی میں سے ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء کے ایک مکتوب میں علامہ موصوف نے جناب جناح کو خراجِ اعتماد پیش کرتے ہوئے یہ لکھا تھا ——

> ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں صرف آپ ہی ملت کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔

لکھنؤ کا سالانہ اجلاس

اب جناح پوری ملت کی نگہ امید کے مرکز تھے۔ ملت اپنی عقیدت اور اعتماد کے اظہار میں انھیں "قائدِ اعظم" کے خطاب سے معنون کر چکی تھی۔ ان کی آواز کروڑوں دلوں کی ترجمان تھی۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی دھواں دھار تقریریں سامراج اور کانگریس کے نمائندوں کے لئے ایک مستقل چیلنج کی شکل اختیار کر گئیں اور قومی اسٹیج سے ان کے نعرہ ہائے حریت نے پورے ملک کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں لکھنؤ میں (اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء میں) مسلم لیگ کا وہ بے مثال سالانہ اجلاس ہوا جس کے جاہ و جلال اور کر و فر نے مخالفین کی صفوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ یہی اجلاس تھا جس میں پنجاب کے یونینسٹ وزیرِ اعظم سر سکندر حیات اور بنگال کی کرشک پرجا پارٹی کے قائد اور وزیرِ اعظم مولوی ابو القاسم فضل الحق اپنے وزراء سمیت بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اہالیانِ انڈیا

سیاسیات میں اپنی وفاؤں کی نذر قائد اعظم کے حضور میں پیش کر دی۔

لکھنؤ کے قومی اجتماع نے واردھا اور آنند بھون کے سامریوں کے سارے طلسم توڑ کر رکھ دیئے۔

اسی اجلاس سے متاثر ہو کر یوپی کے ایک دور اندیش کانگریسی رہنما ڈاکٹر محمود اللہ نے کہا تھا۔۔۔

اس وقت دو بڑی ایشیائی تہذیبوں کے تصادم کا فوری اور ہولناک امکان ہے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی ہے اور مسلمان کسی چیز سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا جنگ کرنے سے۔ (مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

یہ اجلاس اسلامیانِ ہند کی قومی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کا ایک انقلاب آفریں موڑ ثابت ہوا۔ ملت کے قلب کی گہرائیوں سے امنگوں اور آرزوؤں کا ایک نیا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ان کے خون میں بازآفرینیوں کی ایک نئی لہر موجزن ہو گئی۔ یوں سمجھئے کہ مدتوں کے بعد انھوں نے اپنی گم گشتہ منزل کو پالیا۔۔۔ اپنے آپ کو پالیا۔

اب یہ قافلہ ایک نئے عزم اور نئے ولولوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسلمانانِ ہند اپنے اجتماعی بقاء کے لئے اب مردانہ وار اور پوری یکجہتی و ہم آہنگی سے اپنے دشمنوں کے بالمقابل نبرد آزما تھے۔ ان کی صفوں میں پہلی بار مدت کے بعد نظم و ضبط کی حوصلہ زا کیفیت نظر آ رہی تھی۔ اور اسی کا صدقہ تھا کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کی شاطرانہ چالیں، مکروہ سازشیں اور ناپاک منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

پاکستان کی تحریک کا آغاز

اجلاس لکھنؤ کے کوئی ڈھائی برس بعد لاہور میں (مارچ ۱۹۴۰ء) آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجتماع ہوا۔ قائد اعظم نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی۔ اور پہلی بار قرارداد پاکستان کے ذریعے حق خود اختیاری اور استقلال کی منزلِ مقصود کی طرف قومی سفر کا آغاز کیا۔ قرارداد لاہور ایک بانگِ رحیل تھی جس کی آواز سنتے ہی ہماری ملت کا قافلہ سامانِ سفر باندھ کر رواں دواں آگے بڑھا اور بالآخر سات برس بعد اس نے منزلِ مقصود پر اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ تحریک پاکستان ہمارے اس سلسلۂ تحریر کا ایک الگ اور مستقل عنوان ہوگا۔ اس عنوان کے تحت ہم اس تحریک کی طویل داستان پوری تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس مرحلہ پر ہم صرف یہی بتانے پر اکتفا کریں گے کہ مارچ ۱۹۴۰ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک اس صبر آزما سفر کے دوران بڑے بڑے نازک مرحلے ملت کے سامنے آئے۔ بڑے بڑے عیار اور مکار دشمنوں سے ٹکراؤ ہوا۔ بڑی بڑی خطرناک سازشوں سے الجھنا اور بڑی بڑی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن قائد اعظم کی قیادت وہ یگانۂ روزگار اور عظمت آفریں قیادت تھی جس کے مقابلے میں مشکلات و موانعات کے پہاڑ پانی ہو کر بہ گئے ابتلا و آزمائش کے طوفان گرد کی طرح بیٹھ گئے اور ملت اس جاہ و جلال سے پاکستان کی منزلِ مراد تک پہنچی کہ دنیا کے طول و عرض سے بے ساختہ تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوئے اور مشرق و مغرب نے برملا شہادت دی کہ قائد اعظم جیسا

ریب اس دور کے ایک عظیم ترین سیاست دان تھے۔

دنیا کے عظیم ترین اخبار "لندن ٹائمز" نے لکھا

انھوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور بین ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں ایسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشان باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔

آقائے علی اصغر حکمت سفیر ایران نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ــــ

ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی مانند ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائد اعظم کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دیگی۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو ان کی عظمت پر نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

زندگی کے حقائق کو جانچنے، پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بلا کے محتاط اور غیر جانبدار، معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر مگر حتمی مقصد کے لئے ناقابل شکست چٹان۔

سی۔ آر۔ داس کے الفاظ سنیئے ــــ

مسٹر جناح صرف مسلمانوں ہی کی نہیں دولت ہیں۔ وہ پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔

سابق وزیر اعظم انڈونیشیا سلطان شہریار نے کہا تھا ــــ

مسٹر جناح بے حد پرکشش انسان ہیں ــــ ایک مقناطیسی کشش ــــ ان کی آواز میں صداقت اور خلوص کی ایسی قوت کارفرما نظر آتی ہے جو میں نے بہت کم زعماء میں دیکھی ہے ــــ بہت ہی کم زعماء میں ــــ میں عصر حاضر کے اکثر زعماء سے ملا ہوں۔ لیکن اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں جتنی کاملانہ قدرت قائد اعظم کو حاصل ہے کسی دوسرے میں نظر نہیں آتی۔

سابق صدر امریکہ مسٹر ٹرومین نے ان کی وفات پر کہا تھا ــــ

دولت پاکستان کا معمار ــــ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد حکومت پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

چند احادیث کے اشکالات اور انکی توضیح

[ترجمان القرآن، بابت اگست ۱۹۶۰ء کے باب "رسائل و مسائل" میں عنوانِ بالا کے تحت، کسی مستفسر کے چار سوالات (جن کا نام نہیں دیا گیا) اور مودودی صاحب کی طرف سے ان کے جوابات شائع ہوئے ہیں۔ ہم ان سوالات اور جوابات کو قارئینِ طلوع اسلام کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے، من وعن نقل کرتے ہیں۔ طلوع اسلام]

سوال۔ ایک عرصے سے دو تین چیزیں میرے دماغ پر بوجھ بن رہی ہیں۔ اس لئے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

(۱) بخاری شریف کی تیسری حدیث میں نزولِ وحی اور حضورؐ کی کیفیات کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطراب طاری ہو گیا تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گھبرائے کیوں تھے؟ یہ بات کہ یہ رسالت کی ذمہ داریوں کے احساس کا نتیجہ تھا دل کو مطمئن نہیں کرتی۔ ورنہ ورقہ کے پاس لے جانے کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ بعض لوگوں کا یہ اشتباہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس وقت اپنی رسالت کا کما حقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا، کچھ بامعنی بات نہیں معلوم ہوتی۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو جن کے پاس آپؐ یہ معاملہ لے کر گئے تھے کیا وہ ان کیفیات کے پس منظر کو حضورؐ سے زیادہ جانتے تھے۔ ورقہ کے یہ الفاظ "ھذا الناموس الذی انزل اللہ علیٰ موسیٰ" اس امر کے موید ہیں کہ واقعی حضورؐ پر اپنی رسالت کا کما حقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد صورت حال مزید مخدوش ہو جاتی ہے۔ صحیح صورت حال کیا ہے؟

(۲) باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ، حدیث نمبر ۲۶۶ میں صحابہ کی ارادت مندی اور عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے عروہؓ ذکر کرتے ہیں۔ فواللہ ما تنخم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخامۃ الا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ[1] "نخامہ" کھنکار کو بھی کہتے ہیں اور جو غلیظ مواد ناک سے نکلتا ہے، اس کو بھی۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کھنکار کھنکارتے تو ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا تو وہ اسے اپنے چہرہ اور کھال پر مل لیتا۔

ان میں سے جو بھی ہو بہرحال قابلِ غور ہے۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تنخامہ کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جو عام طور پر ہوتی ہے؟ یا فرطِ عقیدت کی وجہ سے صحابہ کو اسے چہرے اور جسم پر مَل لینے میں اجنبیت نہیں محسوس ہوتی تھی حضورؐ کی نظافت پسندی اس میں حائل کیوں نہ ہوئی؟

(۳) باب استعمال فضل وضوء الناس حدیث ۱۵۵ میں آتا ہے دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقدح فیہ ماءٌ فغسل یدیہ ووجھہ فیہ ومجّ فیہ ثم قال لھما اشربا وافرغا علیٰ وجوھکما ونحورکما[1] پانی کے برتن میں ہاتھ دھونا۔ پھر اس میں کلی کرنا۔ اور ان سب کے بعد لوگوں سے کہنا کہ اسے پیو اور اس سے منہ دھوؤ۔ یہ سب کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظافت پسندی کے عام کلیہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ پھر صحابہ کا اس سلسلہ میں بے خود ہو کر اس کو استعمال کرنا اور بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

اقبال اور حدیث

(۴) اقبال مرحوم کو پاکستان میں قبولِ عام حاصل ہے۔ بالخصوص جدید طبقہ میں۔ اور اسی طبقہ میں پرویزی حضرات بھی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ مشہور کر رہے ہیں کہ اقبال بھی منکرِ حدیث تھا۔ صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ انگریزی خطبات میں مرحوم نے جن ماخذ کا ذکر کیا ہے ان میں حدیث کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل اور توضیح میں جن نکات کا مرحوم نے ذکر کیا ہے ان سے مرحوم کا اپنا نظریہ منکرینِ حدیث کی حوصلہ افزائی کا موجب سا بن گیا ہے۔"

جواب:- آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کا مختصر جواب حاضرِ خدمت ہے۔

(۱) نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپؐ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گذرا تھا کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں، نہ اس کی کوئی خواہش کبھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لئے آپ پہلے سے کوئی تیاری کر رہے تھے اور اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آنے گا۔ آپؐ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپؐ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس حالت میں جب یکایک غارِ حرا کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپؐ کے اوپر فطرتاً اس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایک بشر پر طاری ہونی ہی چاہیئے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی طرح تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ جنھوں نے طبعِ مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا۔ پھر آپؐ نے اس میں اپنے دونوں ہاتھوں اور چہرہ کو دھویا اور اس میں کلی کی پھر ان دونوں سے کہا کہ اسے پی لو اور اپنے چہروں اور سینوں پر ڈال لو۔

گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا۔ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر کیا گیا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے۔ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں۔ اب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کس طرح لڑ سکوں گا۔ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔ اسی وجہ سے جب آپ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ مجھے اڑھا دو۔ مجھے اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھہرا تو بیوی خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا "لقد خشیت علی نفسی" مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ انھوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابداً۔ انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق "ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم آپ کو اللہ کبھی رنج نہ دے گا آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں۔ بیکسوں کی مدد کرتے ہیں۔ نادار کی دست گیری کرتے ہیں۔ مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں"۔ پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ انھوں نے حضورؐ کی کیفیت سن کر بلا تامل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا"۔ اس لئے کہ وہ بچپن سے لے کر جوانی تک آپ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انھوں نے .....

...اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیماتِ انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور سچی نبوت ہے۔

یہ سارا نقشہ ایسا فطری اور معقول ہے کہ اس صورت حال میں یہی کچھ ہونا چاہیئے۔ اس پر شک کا پیدا ہونا تو درکنار میرے نزدیک تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے اہم ترین دلائل میں سے ہے۔ اگر یہ معاملہ اس طرح پیش نہ آتا اور آپ یکایک جا سے آتے ہی بڑے اطمینان کے ساتھ فرشتے کی آمد کا واقعہ مجمع عام میں سنا کر اپنی نبوت کا دعویٰ پیش فرماتے تو ایک آدمی یہ شک کر سکتا تھا کہ حضرت پہلے سے اپنے آپ کو نبوت کا اہل سمجھے بیٹھے تھے اور دو ایک غار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کب کوئی کشف و الہام ہوتا ہے۔ آخر شدتِ مراقبہ نے ذہن میں ایک فرشتے کا نقشہ پیش کر دیا۔ اور کانوں میں آوازیں بھی آنے لگیں، معاذ اللہ۔ لیکن خدا کے فضل سے وہاں نبوت کا ارادہ اور اس کی خواہش اور کوشش تو درکنار جب بالفعل وہ مل گئی تب بھی چند ساعتوں تک عالم حیرت ہی طاری رہا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب نبوت کے منصب عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لئے رب کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑے۔

(۲) دوسرے نمبر پر آپ نے جس واقعہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ وہ درحقیقت کسی تعجب کا محل نہیں ہے۔ بس ذرا اس امر پر غور کیجئے کہ معاملہ ایک نبی کا ہے اور ان لوگوں کا ہے جو سچے دل سے مان چکے تھے کہ حضورؐ نبی ہیں اور اپنے درمیان اس عظیم المرتبت ہستی کو موجود پا رہے تھے۔ اس مرتبے کی ہستیوں کا جو زبردست اثر ان لوگوں پر ہو سکتا ہے جنھیں یقین ہو کہ ہمارے سامنے وہ شخص موجود ہے جسے اللہ سے مکالمہ کا شرف حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ فرض کر لیں۔ یہ انبیاء کا غیر معمولی اثر ہی تو تھا جس کی بدولت ان کے معتقدین میں سے بکثرت لوگ حد پر نہ رک سکے اور غلو کر کے انھیں خدا اور ابن اللہ اور اوتار اور نہ معلوم کیا کیا بنا بیٹھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں لوگوں کو حد اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے جو کوششیں فرمائیں وہ سب کو معلوم ہیں مگر اس کے ساتھ آپ نے انسانی فطرت کی رعایت بھی ملحوظ رکھی اور حد اعتدال کے اندر جہاں تک شدت عقیدت کو جانے کی اجازت دی جا سکتی تھی وہاں تک جانے سے لوگوں کو نہیں روکا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت لوگوں نے حضورؐ کا تھوک زمین پر نہ گرنے دیا اور آگے بڑھ کر اسے ہاتھوں پر لینے اور اپنے منہ پر اور جسم پر مل لینے کی کوشش کی تو آپ نے منع نہ فرمایا۔ رہی یہ بات کہ خود لوگوں کو گھن کیوں نہ آتی تھی تو یہ کیوں لگا کہ عام انسانوں کے تھوک سے تو ضرور گھن آسکتی تھی مگر جس منہ پر خدا کا کلام اترتا ہو اس کے تھوک سے گھن آنا تو درکنار اہل ایمان کی نگاہ میں تو عطر کی بھی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۳) تیسرے واقعہ کی نوعیت بھی وہی ہے جو اوپر کے واقعہ کی ہے لیکن اس کی پوری تفصیل جو بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الطائف میں آئی ہے اگر نگاہ میں رہے تو وہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اوپر میں نے بیان کی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے غزوہ حنین کے غنائم برسر موقع تقسیم کرنے کے بجائے جعرانہ پہنچ کر تقسیم کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا اور اس کی وجہ سے بعض نئے نئے ایمان لائے ہوئے لوگ بڑے بے صبرے ہو رہے تھے۔ جب آپ جعرانہ پہنچے تو ایک بدو نے آکر اپنے حصے کا تقاضا کیا۔ حضورؐ نے فرمایا "تجھے بشارت ہو (یعنی اس بات کی بشارت کہ عنقریب حصے تقسیم ہوں گے اور اب تک جو تو نے صبر کیا اس کا اجر ملے گا)۔ اس نے ترش ہو کر کہا۔ "آپ کی یہ بشارتیں میں بہت سن چکا ہوں"۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت بلالؓ اس وقت حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "اس نے میری بشارت رد کر دی۔ تم دونوں اسے قبول کرو"۔ دونوں نے عرض کیا "ہم نے قبول کی"۔ پھر آپ نے ایک پیالہ بھر پانی منگایا۔ اس میں ہاتھ اور منہ دھویا اور کلی کی پھر دونوں صاحبوں سے فرمایا تم اسے پی لو اور اپنے منہ اور سینے پر ڈالو اور بشارت لو۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی کیا۔ پردے کے پیچھے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیٹھی تھیں۔ انھوں نے پکار کر دونوں صاحبوں سے کہا کچھ اپنی ماں کے لئے بھی بچا لینا۔ یہ سن کر انھوں نے تھوڑا سا پانی بچا لیا اور انھیں بھی دیا۔

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور دراصل اس بدو کو یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس نے جو اس بے بہا بشارت کو رد کیا ہے یہ کیسی ناشکری اور بدبختی ہے اور سچے اہل ایمان کا اپنے نبی کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا

ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت کا انداز اور پھر امِ سلمہؓ کا اس پانی میں سے اپنا حصہ طلب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرات اس مبارک پانی کو لے کر پینے اور منہ اور سینے پر ملنے میں کراہت محسوس کرنا تو درکنار، اسے اپنے لئے آبِ حیات سمجھتے تھے۔ اس کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ کر مسابقت کرتے تھے اور انھیں یہ فخر تھا کہ یہ نعمت انھیں نصیب ہوئی۔

(۴) "اقبال اور حدیث" والے سوال کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے اس مسئلے کی ہمیں سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کہ حدیث کے متعلق اقبال مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفاء راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علمائے امت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن ان حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

طلوعِ اسلام:۔ یہ تینوں احادیث، جن کے متعلق مستفسر کے دل میں شبہات پیدا ہوئے ہیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ یہ وضعی ہیں اور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے خلاف اتہام۔ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نزولِ وحی سے متعلق حدیث، عیسائیوں کی وضع کردہ ہے جو مسلمانوں سے کہنا یہ چاہتے تھے کہ جو بات تمہارے نبی کو معلوم نہ ہو سکی اسے ہمارے ایک عالم نے بتا دیا اور اس سے ان کا اطمینان ہو گیا ــــ یا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ (معاذ اللہ) ایک عیسائی عالم کے کہنے سے تمہارے نبی اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گئے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ بات یونہی کہہ دی ہو۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یاد رہے کہ یہ عیسائی (ورقہ بن نوفل) یہ کچھ کہنے کے باوجود حضورؐ کی نبوت پر ایمان لا کر مسلمان نہیں ہوا تھا۔ وہ عیسائی رہا اور عیسائی مر گیا تھا۔

دوسری اور تیسری احادیث اس زمانے کی وضع کردہ نظر آتی ہیں جب مسلمانوں میں پیر پرستی شروع ہو گئی تھی۔ صحابہ کبارؓ کی رسول اللہ سے محبت اور عقیدت میں کیسے کلام ہے۔ لیکن آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ نبی اکرمؐ اس قسم کی باتوں کا حکم دیتے تھے یا انھیں گوارا فرما لیتے تھے۔

ہم نے اس "سوال و جواب" کو یہ تبلیغ کے لئے نقل کیا ہے کہ احادیث کے اشکال کی وضاحت میں ان حضرات کا کیا انداز ہے؟ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مودودی صاحب، بخاری کی ہر حدیث کو بلا تنقید قبول کرنے کے حق میں نہیں۔ لہٰذا انھوں نے ان احادیث کو اپنے اصولوں کے مطابق چھان پھٹک کر صحیح تسلیم کیا ہے۔

طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

طلوعِ اسلام کے مندرجہ ذیل پرانے پرچے حاصل کرنے کے لئے خط لکھیں اُن احباب کو ترجیح دی جائے گی جو سیٹ مکمل کرنے کے لئے طلب فرمائیں گے۔ ۵۴ء اپریل، ستمبر ۵۵ء (ہفتہ وار) شمارہ ۱-۲-۳-۴-۹-۱۵-۱۶-۱۸-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۹-۳۱-۳۴-۳۷-۴۰-۴۳-۴۵-۴۶-۴۸۔ ۵۶ء جون، جولائی۔

پتہ۔ ملک حنیف وجدانی۔ سنبل سیداں۔ ڈاکخانہ۔ موہڑہ سیداں۔ مری

لغات القرآن

(پہلی جلد)

جس کا برسوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا ہوا شاہکار

قرآن کے الفاظ —— قرآن کے تصورات —— قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اول میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکیں گے۔

جن احباب نے یہ علم افروز کتاب حاصل نہیں کی وہ اسے جلد حاصل کر لیں، کیونکہ ایسی نادر کتب بار بار طبع نہیں ہوتیں!

ٹائپ کی حسین، دلآویز طباعت۔ بہترین سفید کاغذ۔ پائیدار، سنہری دیدہ زیب جلد

قیمت:—— پندرہ ۱۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوع اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

نہ کتابوں کی تلاش کی زحمت اُٹھایئے

نہ محصولڈاک خرچ کیجیے!

آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کتاب کہاں سے ملے گی۔ جب آپ معلوم کرلیں گے تو پھر آپ کو اس کتاب کی قیمت کے علاوہ محصولڈاک بھی ادا کرنا ہوگا۔ آپ اس زحمت اور خرچ سے بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ مکتبہ طلوعِ اسلام کی

پیشگی خریداران کی اسکیم

میں شامل ہوجائیں۔ یہ اسکیم کیا ہے؟ فقط اتنی کہ آپ ایک سو روپے (یکمشت یا دس روپے ماہوار تک کی قسطوں میں) ادا کردیں۔ اس کے بعد آپ کو لاہور سے جس کتاب کی ضرورت ہو اس کے لئے مکتبہ کو ایک کارڈ لکھ دیں۔ کتاب

بلا محصولِ ڈاک

آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گی۔ اور اس کی قیمت آپ کے حساب سے وضع کرلی جائے گی!!

نیز ادارہ طلوعِ اسلام کی تازہ مطبوعات بھی آپ کو خود بخود ارسال کردی جایا کرینگی۔

— اس سہولت سے فائدہ اٹھایئے —

ناظم مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

سرورِ کائنات و فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی کا بصیرت افروز و ایمان افزا اردو ترجمہ

مظاہرِ حق اردو ترجمہ مشکوٰۃ شریف

قرآن مجید فرقان حمید کی آیاتِ بیّنات کا جب بھی نزول ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عامۃ المسلمین کی تعلیم وتدریس اور تلقین وتادیب کے لئے اُن کی تشریح وتوضیح فرماتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ احادیثِ نبویؐ کا بیشتر حصہ آیاتِ قرآنی کی وضاحت پر مشتمل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ بنا بریں مستند علمائے دین اور محرمانِ اسرارِ شریعت احادیثِ نبویؐ کو قرآن حکیم کی بہترین مستند ترین اور مفید ترین تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے علاوہ بھی آنحضرتؐ نے مسلمانوں کی روزمرہ اخلاقی روحانی معاشرتی اور اقتصادی ضروریات ومسائل کے متعلق بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے جسے قرآن نے خود مجموعۂ حکمت سے تعبیر کیا۔

کسی مسلمان پر مخفی نہیں کہ رحمۃ للعالمین کے تمام ارشاداتِ گرامی اور معارفِ ربانی صحاح ستہ کی صورت میں محفوظ ہیں اور "مشکوٰۃ شریف" اُن ہی کتبِ صحاح ستہ کا ایک جامع اور ہمہ گیر انتخاب ہے۔ جس کی مضمون وار تبویب کی گئی ہے اور جس میں صحیحین یعنی بخاری شریف اور مسلم شریف کی احادیث کا گنجینۂ حکمت ودانش بھی موجود ہے۔

الحمد للہ حضرت مولانا قطب الدین صاحبؒ نے عامۃ المسلمین کے علمی وروحانی استفادہ کے لئے "مظاہرِ حق" کے عنوان سے "مشکوٰۃ شریف" کا نہایت عمدہ اور عام فہم اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ تمام حصص کتاب پر نظرثانی اور تصحیح مولانا عبدالرحمٰن طارق صاحب سے کرائی گئی ہے۔ جس سے اس کی صحت وافادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے علاوہ ازیں اس مجموعۂ احادیث کے آغاز میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب طارق نے ایک طویل ومبسوط دیباچہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں بذاتہ مشکوٰۃ شریف اور احادیثِ نبویؐ کی ایمان افروز اور اصلاحی وتعمیری صفات وخصوصیات پر بحث کرتے ہوئے فہمِ معانی ومطالبِ قرآن کے لئے حدیث کی ضرورت واہمیت اور دائمی افادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتابت وطباعت حسین ودلکش۔ جہازی سائز یعنی ۲۰×۳۰/۴

ہدیہ کامل سیٹ ——— ۵۰ روپے

——— ناشرین ———

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز (رجسٹرڈ) کشمیری بازار لاہور - بندر روڈ کراچی

حقائق و عبر

۱۔ دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے

یوں تو معاشرہ میں ہر جرم ایسا ہے جس کی مذمت کی جانی ضروری اور جس کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات لابدی ہیں لیکن بعض جرائم ایسے ہیں جو اپنی وحشت و بربریت اور انسانیت سوز سبعیت و بہیمیت میں اس درجہ خوفناک اور الم انگیز ہوتے ہیں کہ ان کے تصور سے انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ آپ ذرا تصور میں لائیے اس قسم کے جانکاہ حادثہ کو کہ آپ کی چھوٹی سی معصوم بچی، جو ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور اعزہ و احباب کے دل کا سرور ہے، پڑھنے کے لئے اسکول جاتی ہے یا کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہے اور واپس نہیں آتی۔ آپ ادھر ادھر تلاش کرتے ہیں۔ گلی محلے میں اعلان کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ تھانے میں رپٹ لکھواتے ہیں۔ اخبارات میں اشتہارات دیتے ہیں لیکن اس ننھی سی کلی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ذرا آپ سوچئے کہ اس سے آپ اور جملہ متعلقین پر کیا گذرتی ہے؟ آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی بچی کہاں ہے اور اس پر کیا گذر رہی ہے۔ آپ کو اس کا بھی یقینی علم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ واپس آئے گی یا نہیں آئے گی۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کی زندگی کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال آپ کی تمام توجہات کا مرکز اور قلب و نظر کا محور بن جاتا ہے۔ ہر لمحہ آپ کی نگاہوں کے سامنے امید کی نئی کرن نمودار ہوتی ہے جو دوسرے ہی لمحہ میں مایوسی کی تاریکیوں میں بدل جاتی ہے۔ اس بیم و رجا کے عالم میں آپ کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس پر خود یہ بیتی ہو۔ اگر کسی کا بچہ اس کی آنکھوں کے سامنے جان دیدے اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سپردِ خاک کر آئے تو دو چار دس دن بعد آہستہ آہستہ اس صدمہ کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن جس بدنصیب باپ کا دل بیم و رجا کے اس آرے کے نیچے چر رہا ہو اس کے زخم کی گہرائیوں اور الم انگیزیوں کا کیا ٹھکانہ!

اس قسم کے واقعات پہلے کہیں شاذ ہوتے تھے لیکن اب ملک میں ایسے خطرناک (انسان نما) درندوں کے غول کے غول پھرتے ہیں جو معصوم بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کوئی انسان اس کے سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت ان جانگسل واردات کی روک تھام کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہے اور

وہ اس قسم کے بعض گروہوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب بھی ہوئی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے کامل انسداد کے لئے اس سے کہیں زیادہ سخت اقدامات کی ضرورت ہے سب سے پہلے یہ کہ

اس جرم کی سزا موت ہونی چاہیئے۔

اور سزائے موت متعلقہ گروہ میں سے ایک فرد کے لئے نہیں بلکہ گروہ کے تمام افراد کے لئے۔ جو مجرم ہمارے ہاں سے کپڑے کی گٹھری "اغوا کرکے" واہگہ پار لے جانے کی کوشش کرے، اگر اسے گولی سے اڑایا جا سکتا ہے، تو جو درندہ معصوم بچے کو اغوا کرے اسے حوالہ دار ورسن کیوں نہ کیا جائے؟

دوسرے یہ کہ اس قسم کے جرائم سے متعلق مقدمات کو زیادہ لمبا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ تحقیقِ جرم کے مراحل کو کم از کم وقت میں ختم کرکے فوری سزا دے دینی چاہیئے۔ انسدادِ جرائم پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ ان مقدمات کی کارروائی اور سزا کی تشہیر ملک کے تمام اخبارات میں جلی حروف میں کی جانی چاہیئے۔

لیکن اس باب میں ساری ذمہ داری حکومت کے سر پر ہی عاید نہیں کر دینی چاہیئے۔ اس میں، ملک کے باشندوں کو بھی زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے۔ مثلاً

(۱) ہر گاؤں، قصبہ یا شہر میں خاص اس مقصد کے لئے کمیٹیاں بنائی جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ "بنیادی جمہوریتوں" کے ارکان اس مقصد کے لئے زیادہ موزوں ہوں گے۔

(۲) جونہی اس قسم کے واقعہ کی رپورٹ، کمیٹی تک پہنچے، وہ ایک طرف تحقیقات میں پولیس کی مدد کرے۔ اور دوسری طرف ملک کے تمام اخبارات میں اس کی عام نشر و اشاعت کرے۔ اور اس سلسلہ کو جاری رکھے تاوقتیکہ یہ تلاش و تحقیق آخری منزل تک نہ پہنچ جائے۔

(۳) ہر قسم کے اخبارات کا فریضہ ہو کہ وہ ان خبروں کو نمایاں طور پر شائع کریں اور اس میں کسی قسم کا بخل یا تساہل نہ برتیں۔

(۴) اس خبر کے ملتے ہی، دوسرے مقامات کی کمیٹیاں، اپنی اپنی جگہ مصروفِ تفتیش ہو جائیں۔ نیز بارڈر کی پولیس بھی چوکنی ہو جائے۔

مقصد یہ ہے کہ جب کسی کا بچہ گم ہو جائے تو ملک کا ہر فرد یہ محسوس کرے کہ اس کا اپنا بچہ گم ہو گیا ہے اور اس کی تلاش میں وہی کچھ کرے جو وہ اپنے بچے کی گمشدگی کی صورت میں کرتا۔

ہمارا خیال ہے کہ جب تک ملک میں اس قسم کے اقدامات نہیں کئے جائیں گے اغوا کی یہ وارداتیں ختم نہیں ہوں گی لہٰذا حکومت اور ملک کے حساس طبقے سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس سوال کو اپنی اولیں توجہ کا مرکز قرار دیں۔

۲۔ فرقہ داریت کے خلاف

لاہور سے جماعت اہل حدیث کا ایک نیا پرچہ شائع ہوا ہے جس کا نام "تنظیم اہل حدیث" ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، لائلپور کا ہفتہ وار اخبار "[illegible]" اپنی ۲۹ [illegible] کی اشاعت میں رقمطراز ہے۔

> اسلام میں فرقہ داریت ـــــ اور اس سے آگے بڑھ کر فقہی اور کلامی مسائل کی بنیاد پر عوام میں تفرقہ کو ہوا دینا کس حد تک درست ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور تفصیل کا محتاج ہے۔ یہاں [illegible] ناممکن ہے۔ بجز اس کے کہ اجمالاً کہہ دیا جائے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کا ایک ہی نام رکھا ہے اور وہ "مسلم" ہے۔ اس کے سوا جتنے نام ہیں ممکن ہے انہیں کسی خاص ضرورت کی بنا پر بطور تخلص کے امتیازی اختیار کیا جا سکے لیکن اس نام کو نام قرار دینا اور اس پر ایک ایسی تنظیم جس میں عوام و خواص بھی شامل ہوں اور وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے بڑی حد تک الگ سمجھیں اور ان کے قائدین اس تنظیم کے ممبروں میں مغائرت پیدا کرنے کے لئے تعصب کی کیفیات ابھاریں۔ یہ طرز فکر و عمل اس تصور اتحاد ملت کے خلاف دکھائی دیتا ہے جس کی تائید قرآن کرتا ہے اور جو "امت واحدہ" کے لئے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

فرقہ داریت کے خلاف وعظ کہنے والے یہ حضرات وہی ہیں جو کل تک اپنے اس کارنامہ کو بہت عظیم بتا رہے تھے کہ انہوں نے سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں مسلمانوں کے "مسلمہ فرقوں" کی حیثیت کو آئینی طور پر تسلیم کرا لیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مار مار کر لوگوں کو قرآن کریم کی طرف لا رہے ہیں!

فرقہ وارانہ امتیازات کو بطور تخلص اختیار کرنے کی بھی ایک ہی رہی! لیکن ہمیں اس قسم کے تخلص عہد نبوی اور زمانہ خلافت راشدہ میں کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اس لئے کہ خدا نے برملا کہہ دیا تھا کہ اس نے اپنے رسول کو "شاعری" نہیں سکھائی، نہ ہی شاعری اس کے شایان شان تھی۔ یہ تخلص اس زمانے کی ایجاد ہیں جب دین سے "شاعری" شروع ہو گئی تھی۔ اور وہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

المنبر نے کہا ہے کہ "اسلام میں فرقہ داریت .... کس حد تک درست ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے اور تفصیل کا محتاج" ہم اپنے موقر معاصر کے اس تفصیلی جائزہ کا بشدت سے انتظار کریں گے۔ یہ اس لئے کہ یہ چیز دیکھنے کے قابل ہوگی کہ جس بات کو قرآن کریم بہ نص صریح شرک قرار دیتا ہے اسے یہ حضرات کس حد تک درست سمجھتے ہیں۔ اس وقت یہ "عظیم حقیقت" سامنے آئے گی کہ شرک بھی ایک حد تک درست ہو سکتا ہے۔

۳۔ اسلامی گوئبلز

نازیوں کے گوئبلز کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اس کا مقولہ تھا کہ جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے تو وہ سچ

بن جاتا ہے۔ دنیا اس کے اس مقولے پر ہنستی رہی لیکن دورِ حاضر میں مجاہدوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر احتیاط سے رکھ لیا تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے کام لیا جاسکے۔ اس مقولے سے کام لینے کی مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی جنوری سنہ ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں ایک تمہیدی نوٹ شائع ہوا ہے۔ پہلے اسے ملاحظہ فرمائیے۔

> پچھلے دنوں دمشق میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "پردہ" کا عربی ترجمہ "الحجاب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا پہلا نسخہ جب ہمارے پاس پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ ناشر نے دمشق کے ایک سلفی عالم استاذ ناصر الدین الالبانی سے یہ تعقیب لکھوا کر اسے اصل کتاب کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس تعقیب میں استاذ البانی نے عورتوں کے لئے حدودِ ستر کے مسئلہ میں مولانا مودودی سے اختلاف کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محرم مردوں کے سامنے عورت کو نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے بلکہ وہ ان کے سامنے سر، بازو اور پنڈلیاں بھی کھلی رکھ سکتی ہیں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے سب سے پہلے ان احادیث پر کلام کیا ہے اور انہیں ضعیف قرار دیا ہے جن سے "پردہ" میں عنوان "عورتوں کے لئے ستر کے حدود" کے تحت استدلال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ احادیث قرآن اور سنتِ ثابتہ کے خلاف ہیں۔

یعنی استاذ البانی نے یہ اعتراض کیا کہ مودودی صاحب نے اپنے مسلک کی تائید میں ضعیف حدیثوں کا سہارا لیا ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ یہ حدیثیں واقعی ضعیف تھیں۔ لیکن دیکھئے کہ مودودی صاحب اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ

> ایک ضعیف حدیث اگر کسی مضمون کے بیان کرنے میں منفرد ہو تو اس کے ضعفِ سند کی وجہ سے اس کا حکم بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر متعدد ضعیف احادیث ایک مضمون کے بیان کرنے میں متفق ہوں تو چاہے ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً بلحاظِ اسناد کتنی ہی ضعیف ہو، ان کا مشترک مضمون قوی ہو جاتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴)

غور فرمایا آپ نے اس اصول پر کہ غلط بات اگر ایک جگہ لکھی ہوئی ملے تو وہ غلط ہوتی ہے لیکن اگر وہ دس جگہ لکھی ہوئی ہو تو اسے صحیح سمجھنا چاہیئے!

ایک مقام پر استاذ البانی نے اعتراض کیا کہ مودودی صاحب کی پیش کردہ روایت قرآن کے معارض ہے۔ اس اعتراض کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

> اس معارضہ کے متعلق تو بعد میں کچھ عرض کروں گا لیکن آخر ابن جریر اور ابن جریج جیسے دو فقیہوں اور مفسروں کے بارے میں استاذ محترم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ فہمِ قرآن سے اس درجہ عاری تھے کہ ایک روایت نقل کر گئے اور ذرا نہ سمجھے کہ یہ قرآن کے معارض ہے۔ (صفحہ ۳۱)

یعنی معترض یہ کہتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے خلاف جاتی ہے اور جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب ابن جریر اور ابن کثیر جیسے فقیہوں اور مفسروں نے اسے نقل کیا ہے تو کیا وہ فہم قرآن سے اس درجہ عاری تھے!

یہ مودودی صاحب کا پرانا حربہ ہے۔ یعنی جب اسلاف میں سے کسی کا قول ان کی تائید میں ملے تو جھٹ سے اُسے آگے بڑھا دیا جائے لیکن جب معترض، اسلاف کا کوئی ایسا قول پیش کر دے جو مودودی صاحب کے خلاف جاتا ہو تو اس کا جواب یہ دیا جائے کہ

> بلاشبہ یہ قول حسن بصری اور قتادہ اور اعمش وغیرہم سے منقول ہے۔ مگر یہ لوگ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے کہ ان کے اقوال کو ترک کر دینے سے انسان کافر ہو جائے ...... آخر معلوم تو ہو کہ یہ حضرات کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔
>
> (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۱۲۳-۱۲۴)

یعنی جب اسلاف میں سے کسی کا قول مودودی صاحب کی تائید میں ہو تو اسلاف، دین میں سند بن جاتے ہیں۔ اور جب ان کا قول ان کے خلاف جائے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کون سے انبیاء تھے!

حقیقت یہ ہے کہ دین سے کھیل کھیلنے والے اس سے پہلے بھی بہت سے گزرے ہیں، لیکن جس حد تک ہمارے زمانے میں دین کو بازیچۂ اطفال بنایا گیا ہے، اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ عندالضرورت جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب، اضطراری حالت میں "وقتی نکاح" جائز، اپنے گھر کے اندر شراب کا کشید کرنا اور پینا کوئی جرم نہیں۔ یہ روش عین مطابق "سنت" ہے کہ جن اصولوں کی تبلیغ کی جائے عمل کے وقت ان کے خلاف کیا جائے۔ جب اسلاف میں سے کسی کا قول اپنی تائید میں ہو تو وہ وحی منزل من اللہ کی سی سند، لیکن جو قول اپنے خلاف جائے وہ مردود و مطرود۔ اپنے مطلب کی ضعیف حدیث بھی صحیح، اور اس کے خلاف جانے والی صحیح بھی ضعیف۔ وغیرہ وغیرہ۔

شخصی قوانین

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں قرآن کریم کی رُو سے شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) اور ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) میں کوئی فرق نہیں۔ وہ زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ یہ تفریق اس زمانے میں پیدا ہوئی جب ہمارے سلاطین نے ملکی ریاست کو اپنی اجارہ داری تصور کر لیا اور نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل مذہبی پیشواؤں کے سپرد کر دیئے تاکہ یہ اپنی "مملکت" میں خوش رہیں اور ملکی سیاست سے کوئی تعرض نہ کریں۔ دورِ حاضر کی سیکولر گورنمنٹ کا تصور اسی ثنویت (DUALISM) کا مظہر ہے۔ سیکولر حکومت ملکی قوانین کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل میں لوگوں کو مذہبی آزادی دے دیتی ہے۔ چونکہ یہ تقسیم مذہبی پیشوائیت کے لئے بڑی منفعت بخش ہے اس لئے وہ اسے مستحکم کرنے کی فکر کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان میں "[illegible]"

کے متفقہ فیصلے کے مطابق شخصی اور ملکی قوانین کی اس تقسیم کو برقرار رکھا گیا تھا اور اس پر ان حضرات نے جشن مسرت منایا تھا کہ "مملکت مسلمان ہو گئی ہے"۔ اب ان کی پوری کوشش ہے کہ اس ثنویت کو جدید آئین میں بھی برقرار رکھا جائے تاکہ ملک میں ان کی متوازی حکومت قائم رہے۔

لیکن دیکھئے کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مملکتوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اس قسم کے امتیازات کو مٹا کر قانون کی وحدت کی طرف قدم بڑھائیں۔ اس کی تازہ مثال مصر و شام کا جدید عائلی قانون ہے۔ مصر اور شام کے اتحاد کے بعد دونوں ملکوں کے قوانین کو متحد کرنے کے لئے دو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک کمیٹی مسلمانوں کے شخصی قوانین سے متعلق تھی اور دوسری غیر مسلموں کے شخصی قوانین سے متعلق۔ ان کمیٹیوں نے مسلم و غیر مسلم کے شخصی قوانین کو یکجا کر کے انہیں ملکی قوانین کی حیثیت دینے کی سفارش کی ہے۔ ہمیں ان کمیٹیوں کی سفارشات کا تفصیلی علم نہیں۔ البتہ ترجمان القرآن بابت مئی سنہ ۱۹۶۰ء میں اس ضمن میں جو کچھ شائع ہوا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے تجویز کیا ہے کہ (مثلاً) فسخ نکاح ہر حالت میں عدالتی فیصلہ پر موقوف ہوگا اور طلاق صرف قاضی کے روبرو واقع ہو سکے گی۔ فسخ نکاح کا حق میاں اور بیوی دونوں کو یکساں ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر خاوند دوسری بیوی کرنے کا ارادہ کرے تو پہلی بیوی اس بنا پر بھی فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

چونکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، شخصی اور ملکی قوانین کی تفریق مٹ جانے سے مذہبی پیشوائیت کا اقتدار چھن جاتا ہے اس لئے مسلم ممالک کے ان اقدامات کے خلاف قدامت پرست طبقہ کی طرف سے چیخ و پکار ہو رہی ہے چنانچہ ترجمان القرآن مصر و شام کی اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> کفار اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں پر یہ زیادتی نہ کر سکے تھے کہ ہمارے نکاح و طلاق بھی ہماری شریعت کے مطابق نہ ہو سکیں۔ یہ زیادتی اب ہم پر خود مسلمانوں کے دور حکومت میں ہو رہی ہے۔ پہلے یہ قدم ترکی اور البانیہ میں اٹھایا گیا تھا۔ اب مصر اور تونس اس راہ پر جا رہے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ پاکستان میں قدم بھی اسی راہ پر اٹھ رہے ہیں۔ (مئی سنہ ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۵)

ہم ارباب حل و عقد سے درخواست کریں گے کہ وہ عائلی کمیشن کی سفارشات کو قانونی حیثیت دیتے وقت ان جدید رجحانات کو پیش نظر رکھیں جو مسلم ممالک (شام، مصر، البانیہ، تونس وغیرہ) میں رونما ہو رہے ہیں۔ یہ رجحانات موجودہ زمانے کے تقاضوں کا سراغ دے سکتے ہیں۔

غور طلب سوال یہ ہے کہ اگر مصر و شام میں، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے شخصی قوانین متحد ہو سکتے ہیں تو کیا پاکستان میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین میں اتحاد نہیں ہو سکتا؟ اگر ہم قرآن کریم کو غیر متبدل بنیاد قرار دے لیں اور اس کی راہ نمائی میں متحدہ شخصی قوانین مرتب کر کے انہیں ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیں۔ (یعنی ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو) تو یہ چیز امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے اہم قدم ہوگا جس کی تقلید یقیناً دیگر مسلم ممالک بھی کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے ہمیں ایسا موقع عطا کیا ہے کہ ہم اپنے ہاں قرآنی قوانین رائج کر کے دیگر اقوام کی امامت حاصل کر لیں۔ اگر ہم یہاں صحیح معنوں میں قرآنی نظام رائج کر لیں تو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ سکتی ہے۔

بچوں کی قتل گاہیں

روزنامہ آفاق (لاہور) کی ۹ر اگست کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

خبر ملی ہے کہ کبیر والا کے قریب ایک نو سالہ بچی نے اپنے والد کی مار کے خوف سے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ خودکشی کرنے والی لڑکی گامی کے والد نے پولیس کو بتایا کہ میری لڑکی کو کسی نے بتایا کہ تم نے فلاں باغ سے مالٹے کے جو پودے توڑے ہیں اس کے عوض تمہارا والد تمہیں مارے گا وہ بہت غصے ہو رہا ہے۔ اس بات کے ڈر سے گامی اپنی بہن کے گھر چلی گئی۔ گامی کی شادی شدہ بہن نے اسے سمجھایا کہ تمہیں والد نہیں مارے گا۔ مگر گامی کچھ ایسی خوفزدہ تھی کہ اس نے گھر جانے کے بجائے اپنی بہن کے گھر کے سامنے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔

جس بات نے اس خبر کو قابل اشاعت (یا اخباری زبان میں یوں کہئیے کہ "سنسنی خیز") بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس معصوم بچی نے مار کے خوف سے خودکشی کر لی۔ اگر معاملہ صرف مارپیٹ تک رہتا تو کوئی اس کا نوٹس تک نہ لیتا۔ اس لئے کہ بچوں کو مارنا پیٹنا تو گویا ہمارے معاشرہ کا معمول ہے۔ آپ اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ کتنے گھر (اور دکانیں) ہیں جہاں بچوں کو اس وحشت اور بربریت سے پیٹا جاتا ہے کہ دیکھنے (اور بچوں کی آہ و پکار سننے) والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اگر کوئی شخص بچے پر ترس کھا کر پیٹنے والے کو روکتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتا ہے کہ تم ہماری اولاد کے معاملہ میں دخل دینے والے کون ہو؟ حیرت ہے کہ ہمارے ہاں حیوانات سے بےرحمی کے انسداد کے لئے تو سوسائیٹیاں بن جاتی ہیں لیکن انسانی بچوں کو اس قدر شدید بےرحمی سے بچانے کے لئے کوئی اجتماعی نظام نہیں؟ بچوں کے ساتھ اس قسم کا تشدد، گھروں کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ بات اس سے آگے بھی بڑھتی ہے۔ بچوں کو محلہ کی مسجد یا مکتب میں بھیجا جاتا ہے جہاں ایک انسان نما درندہ معاشرہ کے خلاف اپنی شکایات کا انتقام ان معصوموں سے لے لیتا ہے۔ وہ انہیں اس طرح کی ایذائیں دیتا ہے جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس ایذا کے ڈر سے بچہ دوسرے دن مکتب نہیں جانا چاہتا تو باپ مار مار کر ملکان کر دیتا ہے اور اسے گھسیٹ کر وہاں پہنچا دیتا ہے۔ وہاں پھر ان کی کھال ادھڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ ہمارے عام اسکولوں میں ہوتا ہے نیز ان دکانوں اور کارخانوں میں جہاں بچوں کو شاگرد بٹھایا جاتا ہے۔ ان بچوں کے نزدیک مکتب، مدرسہ یا استاد کی دکان کی کیفیت کس قسم کی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس لطیفہ سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بچے نے دیکھا کہ قصاب بکری کو کان سے پکڑے کھینچے لئے جا رہا ہے اور بکری چلا رہی ہے۔ بچے نے بکری سے پوچھا کہ تو اس قدر چلا کیوں رہی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ مجھے مذبح میں لئے جا رہا ہے۔ بچے نے کہا کہ ہش! میں نے یہ سمجھا کہ یہ تمہیں مدرسے لئے جا رہا ہے!

آج کے بچے کل کی قوم ہوتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جن بچوں کی پرورش اس انداز سے ہو، ان سے جو قوم متشکل ہو گی اس کا انداز کس قسم کا ہو گا؟ ہم قوم کی بدخواہیوں کا رونا روتے رہتے ہیں لیکن جس مسالے سے قوم نے ترتیب پانی ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ہم اور کچھ نہیں کرسکتے تو کیا "مجلس بیرحمی حیوانات" (S. P. C. A) کے خطوط پر "بیرحمی اطفال" کے انسداد کے لئے کوئی سوسائٹی بھی نہیں بنا سکتے؟

ترک سنت کا اثر

لاہور سے ایک سہ روزہ اخبار "ترجمان اسلام" شائع ہوتا ہے ـــ زیر سرپرستی مولانا احمد علی صاحب اور زیر ادارت مولانا غلام غوث صاحب ناظم اعلیٰ نظام العلماء مغربی پاکستان ـــ اس کی ۱۸ اگست کی اشاعت میں "مسلمان اور اسلامی قانون" کے زیر عنوان افتتاحیہ شائع ہوا ہے جس میں "ترک سنت کا اثر" کی ذیلی سرخی کے تحت لکھا ہے۔

> حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانہ کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک قلعہ کے فتح ہونے میں دیر لگ گئی۔ امیر المومنین نے کہلا بھیجا کہ فتح میں اتنے دن لگ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے کوئی سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ترک کردی ہے۔ جب دربار خلافت کا یہ فرمان اسلامی لشکر میں پڑھا گیا، سب سوچنے لگے۔ آخر کار معلوم ہوا کہ جنگی مہمات کی وجہ سے مسواک کا استعمال نہیں ہو رہا۔ فوراً سب نے عمل شروع کردیا اور اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کردی، اور دشمنوں نے مرعوب ہو کر قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔

یزید کی بیعت

حادثۂ کربلا کے سلسلہ میں سُنی حضرات کہتے ہیں کہ امام حسینؓ نے یزید کی بیعت اس لئے نہیں کی کہ وہ فاسق و فاجر تھا یا اس لئے کہ اس سے خلافت کی جگہ ملوکیت کی بنیاد رکھی گئی تھی لیکن سرگودھا سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "المفید" نے (جس کے ایڈیٹر سید بشیر حسین بخاری ہیں) اپنی ۱۶ جولائی کی اشاعت میں لکھا ہے۔

> یہ کہنا کہ چونکہ یزید فاسق و فاجر تھا اس لئے سیدنا امام حسینؓ نے اس کی بیعت نہیں کی۔ سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اگر یزید تقویٰ کے بلند ترین مقام کا بھی حامل ہوتا تو فرزند رسول پھر بھی اس کی بیعت نہ کرتے۔ کیونکہ معصوم کسی غیر معصوم کی بیعت نہیں کرتا۔ امام کسی غیر امام کی بیعت نہیں کرتا۔ آئین علیہ السلام کی عصمت و امامت پر قرآن شاہد ہے۔ (۱۶ جولائی ص۲ کالم ۳)

(بحوالہ ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث۔ لاہور۔ مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء)

لاہور سے ہر قسم کی علمی، ادبی۔ سیاسی کتابیں مکتبہ طلوع اسلام ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ سے منگائیے

لوگ اِس شخص کو منکرِ شانِ رسالت کہتے ہیں!

جس نے

"معراجِ انسانیت"

جیسی کتاب لکھی ہے۔ جو بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ، قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ جنابِ پرویز کو حضور رسالتمآبؐ سے جو والہانہ عشق ہے وہ کتاب کے ایک ایک لفظ سے آشکارا ہے۔

اِس عظیم کتاب کی قیمت بیس روپے ہے۔ لیکن

عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب پر

ایک ماہ کیلئے

اس کی قیمت

پندرہ روپے

کر دی گئی ہے۔ جلد فرمائش بھیجئے۔ کیونکہ اس کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں!

مکتبہ طلوعِ اسلام۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

اِن میں سے کونسی کتاب!

اسلامیات:-

المرشد الامین:- امام غزالیؒ کی ایک بے نظیر کتاب اور ہدایت آمیز کارنامہ ہے جس میں دنیا اور آخرت کے متعلق جملہ انسانی دلچسپیات پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس میں انسان کے لئے ایسے گرانمایہ جمع کر دیئے ہیں جن کے مطالعہ کے بغیر انسان اپنی منزل سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ المرشد الامین کا ترجمہ مولانا مولوی عبدالقدوس صاحب نے کیا ہے۔ قیمت مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش۔ -/8/6

تاریخ اسلام (رئیس احمد جعفری ندوی) اسلام کی یہ تاریخ اپنے اندر عبرت، موعظت، پند و نصیحت، عدل و رواداری، فتح و کامیابی اور علم و حقائق کا ایک گنجینہ پنہاں رکھتی ہے اپنے عظیم اسلاف کے کارناموں کو پڑھنے کے لئے اس تاریخ کو آج ہی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ تاریخ رئیس احمد جعفری کی اسلامی اور ادبی خدمات کا تازہ جاوید شاہکار ہے۔ قیمت مکمل مجلد =/12/

تاریخ اسلام کامل (دو جلدوں میں) اس تاریخ میں آنحضرت سرور دو عالمؐ سے لیکر قائد اعظم محمد علی جناح تک کے تمام واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی فتوحات۔ ترقی اور ان کے اثرات اور دنیا کی اقوام پر سیاسی عروج و زوال پر اختصار کے ساتھ مگر مکمل بحث کی ہے آسان اور عام فہم زبان میں پورے واقعات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ایک کم علم بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح ایک اچھا پڑھا لکھا انسان۔ تمام واقعات مشہور اور مستند تاریخوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مضبوط جلد دو رنگ گرد پوش۔ قیمت ہر دو جلد مکمل۔ نو روپے

سیاسیات:-

پاکستان کا مستقبل (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع) اسلام ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو انسان کو علم و عمل کا پیغام دیتا ہے پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ اس کا اپنا نظام حیات کیا اور کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے آپ اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت:- -/8/2

نفسیات:-

خود اعتمادی (مصنفہ فائق کلہران) اس کتاب میں اُن احوال پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جنہیں اگر مثل زندگی بنایا جائے تو انسان خود اعتماد بن سکتا ہے اپنی ذات پر اعتماد کر کے وہ اپنی بگڑی بنا سکتا اور عروج کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اپنی ذات پر اٹل اعتماد وہ قوت ہے جو پہاڑوں کو راستہ دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ قیمت مجلد مع حسین گرد پوش -/8/4

مکتبہ طلوع اسلام۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

رابطۂ باہمی

بزمِ راولپنڈی

بزم راولپنڈی کی دیرینہ خواہش تھی کہ محترم پرویز صاحب وہاں آکر دو ایک اجتماعات سے خطاب کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لئے وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ وہ ۱۰ اگست کو غیر متوقع طور پر راولپنڈی تشریف لے آئے جس سے احباب کو عید کے انتیس کے چاند جیسی خوشی ہوئی۔ وقت بہت کم تھا لیکن اس کے باوجود احباب کی کوشش سے اجلاس عام کا انتظام کیا گیا۔ راولپنڈی میں گارڈن کالج کا جوبلی ہال سب سے بڑا ہال ہے۔ بعض احباب کا اندازہ ہے کہ اتنا بڑا ہال کسی کالج کا بھی نہیں۔ اس میں قریب بارہ سو کرسیاں ہال میں بچھ رہی ہیں اور گیلری کی نشست ان کے علاوہ ہے۔ ۱۲ اگست ساڑھے سات بجے شام جلسہ کا اعلان تھا لیکن ہال بہت پہلے بھر چکا تھا۔ بعد میں آنے والے حضرات یا تو گیلری میں بیٹھے یا کھڑے رہے۔ اجلاس کی کارروائی کا آغاز محترم قریشی صاحب کی تلاوتِ قرآن کریم سے ہوا۔ اس کے بعد محترم شاد صاحب نے نہایت حسین انداز میں مہمان عزیز کا تعارف کرایا۔ صدارت کے فرائض بزم راولپنڈی کے نمائندہ محترم بھٹی صاحب نے سرانجام دیئے۔ پونے آٹھ بجے کے قریب پرویز صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا جس کا عنوان تھا ــــ خاندانی منصوبہ بندی ــــ یہ تقریر قریب دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ موسم کی گرمی اور ہال میں ہجوم کی وجہ سے فضا میں حدت خاصی تکلیف دہ تھی لیکن اس کے باوجود مجمع میں شروع سے آخر تک جذب و انہماک کا یہ عالم تھا کہ کسی طرف سے کوئی آواز میں کھنکار تک نہیں۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ایسے پرسکون اور کامیاب اجتماعات بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ تقریر کے بعد سوالات کے جوابات دیئے گئے۔ ان جوابات سے متعلقہ موضوع کے بہت سے گوشے اور بھی نکھر کر سامنے آگئے۔ بزم کراچی کے نمائندہ محترم میاں عبدالخالق بھی پرویز صاحب کے ساتھ راولپنڈی تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اربابِ بزم راولپنڈی کو ان کی کوششوں کی ایسی نمایاں کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔ پرویز صاحب کے اس خطاب نے راولپنڈی کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے اور مختلف گوشوں سے یہ تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ ان خطابات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔

۳ر اگست کی شام اراکین بزم کا خصوصی اجلاس ہوا۔ جس میں کراچی کی بزم کے وہ اراکین بھی شریک ہوئے جو دارالسلطنت کی تبدیلی کی وجہ سے کراچی سے راولپنڈی تشریف لے آئے ہیں۔ یہ احباب اب راولپنڈی کی بزم کے اراکین متصور ہوں گے۔ بزم میں ان کی شرکت ارباب راولپنڈی کے لئے تقویت کا موجب ہوگی۔ محترم میاں عبدالخالق صاحب نے بہت سی عمدہ تجاویز پیش کیں جنہیں شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا۔ نیز انھوں نے بزم کراچی کی طرف سے یقین دلایا کہ وہ بزم راولپنڈی سے ہر طرح کا تعاون کرے گی۔ راولپنڈی کے احباب میاں صاحب کی اس حسنِ نوازش کے لئے شکر گزار ہیں۔ آخر میں محترم پرویز صاحب نے احباب راولپنڈی کی مساعی حسنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں بتایا کہ قرآنی فکر کا یہ ننھا سا پودا کتنی جلدی برگ و بار لا رہا ہے وللہ الحمد۔

انتظام کیا جا رہا ہے کہ "الکوثر" میں ٹیپ کے ذریعے درسِ قرآن کا سلسلہ باقاعدہ سلسلہ جاری رکھا جائے اور محترم پرویز صاحب کے خطابات کا تسلسل قائم رہے ـــــ وبیدہ التوفیق۔

سرزمینِ حجاز سے ایک خط

سلام مسنون! ایک روز نماز فجر سے فارغ ہوا ہی تھا کہ بادِ صبا نے کچھ اس قسم کا مژدہ جانفزا سنایا "یہ ریڈیو پاکستان ہے" حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کوئی شخص بھی کورٹ کی اجازت لئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کورٹ سے اجازت لئے بغیر طلاق دے سکتا ہے۔ وغیرہ..... یہ فیصلہ کس قدر پیامِ مسرت لایا ہے۔

آپ کی ذاتِ گرامی، سزاوارِ صد ہزار تحسین و مبارکباد ہے جن کی SINCERE کاوشیں اہلِ دانش کے کانوں تک قرآن کریم کی آواز پہنچا کر اسلامی معاشرہ اور قرآنی نظام قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ جملہ ہم خیال اور حلقہ احباب سے مبارکباد قبول کیجئے۔ خدا کرے۔ ہمارے اربابِ حکومت کو ان نیک کاوشوں میں پوری کامیابی ہو۔ اور ہم ایک بار پھر اس دنیا میں قرآنی نظامِ حکومت رائج دیکھ سکیں۔

زرعی اصلاحات۔ جدید نظامِ تعلیم۔ زکوٰۃ کے بعد یہ اہم مسئلہ حل کر کے یہ ثابت کر دیا جا چکا ہے کہ پاکستان میں انشاء اللہ العزیز ایک اور بس ایک نظام۔ قرآنی نظام ہوگا۔ جس میں آپ کی قرآنی ریسرچ کا بیش تر حصہ شامل ہوگا۔ انشاء اللہ۔

ہم صحرا نشینوں کے لئے تو یہ فیصلہ خاص کر بڑا ہی بامسرت ثابت ہوا ہے جنھوں نے اس ملک کو بھی دیکھا ہے جسے اہلِ پاکستان "ارضِ مقدس" کہتے ہیں۔ اور اہالیانِ ارضِ مقدس سے ملنے کا بھی موقع ملا ہے۔ جن کی اصلیت کا انکشاف یہاں آنے اور ان سے ملنے پر ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی حالت کا کچھ نہ پوچھئے۔ یہاں تو ہر باپ اپنی بیٹی کی شادی پر دولہا سے پانچ سے دس ہزار روپیہ (بطور قیمت) لینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اہلِ زر تین تین چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ جو ان کی امارت اور جاہ و حشم کا نشان ہوتی ہیں۔ اور ہزاروں غریب ایسے ہیں جو محض شادی کرنے کی حسرت لئے عمریں گذار رہے ہیں۔ اور اسے شریعت کہا

جاتا ہے۔ یہاں قریب بیس دیگر ممالک کے غیر مسلموں کے لئے یہ تین چار شادیوں والا قصہ بڑا ہی تعجب خیز ہے جس پر ان سے اکثر گفت و شنید ہوتی رہتی ہے۔ اسلام کو اس قسم کا مضحکہ بنانے میں ہمارے مذہبی ٹھیکیداروں کا پورا ہاتھ ہے۔ اگر طلوعِ اسلام کی سعی یونہی جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ جب بہت جلد ان کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

یہ مقام...... داہران سے تقریباً دس میل اس طرف اندرونِ صحرا ہے۔ جہاں اپنی پوری ہمت سے طلوعِ اسلام کا یہ بزم سا دیا جلائے ہوئے ہوں۔ طلبگارانِ حقیقت جس کے گرد اکثر جمع رہتے ہیں۔ داہران کے احباب سے بھی برابر رابطہ قائم ہے۔ آپ کی ارسال کردہ ٹیپ بڑے ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں۔ بمصداق آپ کے آپ کی آواز واقعی ہمارے قبضے میں کہ جب جی چاہتا ہے سن لیتے ہیں۔ اس نوازش کا شکریہ۔ جملہ احباب سے سلام شوق قبول کیجئے۔ والسلام

رپورٹیں

سرگودھا
احباب کی مسلسل کوششوں سے بالآخر سرگودھا میں بزم کا قیام عمل میں آ گیا۔ محترم فیاض علی خاں بزم کے نمائندے منتخب ہوئے ہیں اور انہوں نے بڑے ولولے اور ذوق شوق سے کام شروع کر دیا ہے۔ اراکین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ مقامی اخبارات میں طلوعِ اسلام کے مسلک و مقصد کے سلسلے میں مضامین کی اشاعت کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ابھی ابھی کچھ نئے اور ممتاز احباب نے بزم کی رکنیت قبول کی ہے۔

مری
بزم قرآن کے آئینی تصور کو مری کے گوشے گوشے میں پہنچا رہی ہے۔ دیول اور گھوڑا گلی (دو قریبی گاؤں) اراکین کی توجہ کے مرکز ہیں اور وہاں قرآنی فکر کی روشنی پھیل رہی ہے۔ بزم نے مطبوعات ادارہ کی ایجنسی سولجر کارز شاپ کے سپرد کر دی ہے۔ اور باہر سے آنے والے احباب وہاں سے ہر قسم کا لٹریچر حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں
یہاں بزم قائم ہو گئی ہے۔ حاجی نظام بخش خاں خازک زئی بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹوں کو عوام تک پہنچایا جا رہا ہے۔ نوجوان طبقہ میں مطبوعاتِ ادارہ کے مطالعہ کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اور قرآنی فکر کی روشنی خاطر خواہ اثر پیدا کر رہی ہے۔

چنیوٹ
بزم کی طرف سے پمفلٹوں کی تقسیم کی مہم کامیابی سے جاری ہے۔ بزم نے چار نئے رکن بنائے اور طلوعِ اسلام کے کچھ خریدار۔ طلوعِ اسلام کے اٹھارہ پرچے مزید ماہوار بڑھائے گئے ہیں۔

سید حسین (ضلع جہلم)
بزم مقامی طور پر بھی اور علاوہ بریں شہر جہلم میں بھی ادارہ کی مطبوعات برائے مطالعہ تقسیم کر رہی ہے اور ہر جگہ اس کے اثرات خوشگوار نتائج پیدا کر رہے ہیں۔

چک ۱۹۸ ڈھول والا (ضلع جھنگ)
بزم کا اجلاس سید الطاف حسین گیلانی کی صدارت میں ہوا۔ اراکین بزم کے علاوہ معززین علاقہ نے

بھی اجلاس میں شرکت کی۔ مہر شاہ محمد صاحب چیئرمین یونین کونسل نے پمفلٹوں کی تقسیم کی ذمہ داری قبول کی۔ اجلاس میں اراکین بزم نے تبلیغی جدوجہد کے سلسلے میں پورے عزم کا اظہار کیا۔ محترم الطاف حسین صاحب اور چوہدری شیر محمد صاحب قریبی چک ۲۰۵ میں بھی قرآنی فکر کا پیغام لے کر گئے۔

کویت بزم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ محترم حسین جمال صاحب نمائندہ بزم منتخب ہوئے ہیں۔

نئی بزموں کی منظوری کا اعلان

سرگودھا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں اور کویت میں نئی بزمیں قائم ہوئی ہیں۔ ادارہ ان بزموں کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔

پرنٹنگ ہر قسم

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا پریس حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ لیکن پریس میں کام کرنے والے کہنہ مشق اور تجربہ کار ہیں۔ ہمارے پریس میں اُردو، عربی اور انگریزی ٹائپ کا کام۔ بلاکوں کی رنگدار چھپائی بلند معیار پر ہوتی ہے۔

آپ ہمیں آزمائشی طور پر کام دیں۔ ہمیں اپنے کام پر بھروسہ ہے کہ آپ عام مارکیٹ سے اعلیٰ اور تسلی بخش پائیں گے۔ شکریہ واجبی۔

منیجر "المیزان" پرنٹنگ پریس

۲۷۔ بی ——— شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

فون:۔ 64406